جدید فلاسفہ سیریز

(یورپی روشن خیالی کا نمائندہ)

قاضی جاوید

والٹیئر

قاضی جاوید

مشعل

آر- بی 5 ' سیکنڈ فلور' عوامی کمپلیکس

عثمان بلاک' نیو گارڈن ٹاؤن' لاہور 54600 ' پاکستان

والٹیئر

قاضی جاوید

ناشر: مشعل

آر۔ بی 5 ' سیکنڈ فلور'

عوامی کمپلیکس عثمان بلاک' نیو گارڈن ٹاؤن' لاہور 54600 ' پاکستان

فون و فیکس: 042-35866859

E-mail: mashbks@brain.net.pk

پہلی بات

اٹھارہویں صدی روشن خیالی کے فروغ کی صدی تھی جس نے یورپ اور اس کے حوالے سے بالآخر پوری دنیا کو تبدیل کر دیا- اجتماعی زندگی پر مذہب کی بالادستی ختم ہوگئی اور اس کی نتیجے میں فرد کی آزادی، عقل کی بالادستی، سائنس کی ترقی، سیکولرازم اور جمہوریت کا عہد شروع ہوا- زندگی کے چلن بدل گئے- علوم وفنون، ثقافت، معیشت اور دوسرے تمام شعبوں میں وہ دوررس تبدیلیاں رونما ہوئیں جو ہماری آج کی دنیا کو پرانی دنیا سے ممتاز کرتی ہیں-

بلاشبہ یہ تبدیلیاں نسلوں کی اجتماعی جدوجہد کا ثمر تھیں- مگر جو افراد تبدیلی کے عمل کی رہنمائی کر رہے تھے، ان میں والتیئر بہت نمایاں ہے- لگ بھگ ساٹھ برسوں تک وہ پرانی دنیا اور اس کو قائم رکھنے والی قوتوں کے خلاف قلم اور زبان سے لڑتا رہا- جب وہ میدان میں گرا تو نئی دنیا جنم لے رہی تھی___ وہ دنیا جس کو وجود میں لانے کے لئے اس نے ان تھک محنت کی تھی-

اس عظیم شخصیت کے بارے میں یہ محض ایک تعارفی کتاب ہے- میں اس کے طبع زاد ہونے کا دعوی کرتا ہوں اور نہ ہی اس کو حتمی سمجھتا ہوں- اس مختصر کتاب کا مقصد بس یہ ہے کہ والتیئر کی شخصیت اور اس کے حاصلات کو اس انداز میں پیش کر دیا جائے کہ نوجوان طلبہ اور عام قارئین والتیئر کے بارے میں بنیادی باتیں جان سکیں-

مجھے ''مشعل'' کے ارباب اختیار کا شکریہ ادا کرنا ہے جنہوں نے مجھے یہ کتاب لکھنے کا موقع فراہم کیا اور مظفر غفار صاحب کے لئے ممنویت کا اظہار کرنا ہے جنہوں نے اس کتاب میں استعمال ہونے والے اکثر فرانسیسی ناموں کا تلفظ سمجھایا۔

قاضی جاوید

14-اگست 2001

ترتیب

1

بچپن

21 نومبر 1694 کو پیرس میں دریائے سین کے مغربی کنارے پر واقع ایک مالدار وکیل کے گھر میں ایک لاغر بچے نے جنم لیا- وہ اس قدر کمزور اور ناتواں تھا کہ کسی کو اُس کے زندہ بچ جانے کی امید نہ تھی- مگر اُس نے سب کے خدشوں کو نہ صرف غلط ثابت کیا بلکہ 84 طویل برسوں تک زندگی کی ایسی بھرپور تخلیقی توانائیوں کا مظاہرہ بھی کیا جو بہت کم لوگوں کو نصیب ہوتی ہیں- لگتا ہے کہ اُس نے اپنی کمزوری کو ہتھیار کے طور پر استعمال کرنا سیکھ لیا تھا- یوں ہم آگے چل کر دیکھیں گے کہ اُس نے اپنا سر ہمیشہ بلند رکھا اور جرات مندی کے ساتھ تمام رکاوٹوں کا مقابلہ کرتا رہا-

اس ناتوان بچے کا نام فرانسواز ماری آرویت رکھا گیا- چوبیس سال کی عمر میں اُس نے اپنا نام خود چنا اور خود کو ''والتیئر'' کہنے لگا- دنیا اُس کو اسی نام سے جانتی ہے- مگر کسی کو معلوم نہیں ہے کہ اس نے اپنا خاندانی نام کیوں ترک کیا- ہوسکتا ہے کہ شہری درمیانی طبقے سے تعلق رکھنے کے باوجود اُس کے مزاج میں پائے جانے والے اشرافی عنصر نے اُس کو اپنا نام بدلنے پر آمادہ کیا ہو- ''والتیئر'' ایک پُر اسرار نام ہے- لغت میں اس کے معنی نہیں ملتے- لہذا اُس کے مختلف سوانح نگاروں کو یہ نام اختیار کرنے کا جواز تلاش کرنے میں اپنے تخیل کی شعبدہ بازیاں دکھانے کا موقع مل گیا ہے- مگر ہم اس کھیل میں شریک نہ ہوں گے-

والتیئر نے اپنے خاندان کا ذکر شاذو نادر ہی کیا ہے- اُس کی تحریروں میں چند مقامات پر خاندان کے قریبی افراد کا تذکرہ آیا ہے- مگر اُس نے اپنے خاندانی پس منظر کو کبھی بڑھا

چڑھا کر پیش کرنے کی کوشش نہیں کی- جو باتیں یقینی طور پر معلوم ہیں، اُن میں سے ایک یہ ہے کہ وہ ابھی سات سال کا تھا کہ اُس کی ماں اس دنیا سے رخصت ہوگئی- والتیئر نے کبھی جذباتی لگاؤ کے ساتھ اس کو یاد نہیں کیا- اُس کی درجنوں تصاونیف میں ماں کا ذکر، سرسری طور پر، صرف پانچ سات سطروں میں آیا ہے- یوں ہم کو یہ جاننے کا موقع ملا ہے کہ وہ اپنے شوہر کے مقابلے میں زیادہ بااثر خاندان سے تعلق رکھتی تھی اور اُس کے خاندان کے اشرافیہ کے ساتھ روابط بھی تھے-

والتیئر نے اپنے باپ فرانسو آرویت کے بارے میں نسبتاً زیادہ لکھا ہے اور اُس کے سوانح نگاروں نے بھی اس محنتی اور کاروباری ذہن رکھنے والے شخص کے بارے میں بعض حقائق قلمبند کیئے ہیں- خود والتیئر کی شہادت سے معلوم ہوتا ہے کہ اُس کا باپ ایک عام سا دنیا دار شخص تھا جس نے مالی آزادی حاصل کرنے اور اپنے اہل خانہ کو اچھی زندگی کے لوازمات مہیا کرنے کے لیئے بہت محنت کی تھی- آخر کار وہ اپنے مقصد میں کامیاب رہا تھا- چنانچہ وہ اس قدر دولت مند بن گیا تھا کہ وہ اور اُس کے بیوی بچے آرام دہ زندگی بسر کر سکیں- والتیئر نے یہ بھی لکھا ہے کہ تخیل سے محروم ہونے کے باوجود اُس کا باپ ادب اور علوم وفنون کی اہمیت کا احساس رکھتا تھا- مگر اُس نے اپنی صلاحیتیں اعلیٰ دنیاوی مقام پانے کے لیئے وقف کیئے رکھی تھیں-

ماں نے والتیئر سے پہلے ایک بیٹے کو جنم دیا تھا- والتیئر کی ایک بہن مارگریٹ کیتھرین تھی- اُس کی ایک بیٹی مادام ڈینس، والتیئر کی بھانجی اور اُس کے گھر کی منتظمہ کے طور پر اٹھارہویں صدی میں مشہور ہوئی- اس کتاب میں مادام کا ذکر کئی بار آئے گا- اور ہم کوشش کے باوجود اُس کتاب کا ایک آدھ سکنڈل نظر انداز نہ کر سکیں گے-

آیئے، فی الحال ہم والتیئر کے بچپن کی طرف واپس چلتے ہیں- یہ ذکر تو ہو چکا کہ وہ لگ بھگ نیم مردہ حالت میں پیدا ہوا تھا- وہ خود کہا کرتا تھا کہ ''میں مردہ پیدا ہوا تھا''- مہربان نرس تھپکیاں دے کر اُس کو زندگی کی طرف واپس لائی تھی- مگر نرس کی مشقت پہلے دن ختم نہ ہوئی- آنے والے دنوں میں وہ غریب حواس باختہ ہو کر کئی بار بھاگتی ہوئی اُس کی ماں کو یہ اطلاع دینے گئی کہ وہ دم توڑ رہا ہے- ہر روز اُس کا دینی باپ اُس کو دیکھنے آتا اور گھر والوں کو اُس کو زندہ رکھنے کے گر بتاتا- بپتسمہ دینے کا وقت آیا تو کمزوری کے باعث

والٹیئر کو گرجے لے جانا ممکن نہ تھا۔ یہ رسم گھر پر ہی ادا کی گئی۔

اس دینی باپ کا نام ایبے دوشاتو نوف تھا۔ اُس نے والٹیئر کی زندگی میں ہم کردار ادا کیا ہے۔ والٹیئر کے ذہن کی ابتدائی تشکیل میں اُس کا حصہ غالباً سب سے زیادہ تھا۔ وہ ایک آزاد منش شخص تھا جس نے والٹیئر کو تین سال کی عمر میں ایک ملحدانہ نظم زبانی یاد کروا دی تھی۔ نظم میں مختلف مذاہب کا مذاق اڑایا گیا تھا۔ نظم رٹنے والے اس ننھے بچے نے آئندہ آٹھ دہائیوں تک مذاہب سے چھیڑ چھاڑ جاری رکھی۔ دینی باپ نے اُس کو اور بھی بہت کچھ سکھایا۔ تعصب اور متعصب لوگوں سے نفرت کرنے کے علاوہ اُس نے شاعری کا درس بھی دیا۔ شاعری سے والٹیئر کا لگاؤ عمر بھر رہا۔ اُس کی پہلی شناخت شاعر کے طور پر ہی تھی۔

دس سال کی عمر میں والٹیئر کو تعلیم کے لئے لوئی لی گرینڈ کے مدرسہ میں داخل کروایا گیا۔ اُس زمانے کے فرانس میں، دنیا کے بڑے حصے کی طرح، تعلیم پر مذہبی فرقوں کی اجارہ داری تھی۔ لوئی لی گرینڈ نامی پیرس کا یہ مدرسہ یسوعی نامی رومن کیتھولک فرقہ نے قائم کر رکھا تھا۔ اس مدرسے میں طلبہ کو الہیات کا درس دیا جاتا، عبادت کے طریقے سکھائے جاتے، یونانی اور لاطینی زبانیں، فن خطابت اور کلاسیکی انداز کی شاعری کا درس دیا جاتا تھا اور کوشش کی جاتی تھی کہ طالب علم قدیم طرز کی کتب کے علاوہ دوسری تحریروں سے دُور رہیں۔ مدرسے میں فرانسیسی زبان بھی پڑھائی جاتی تھی۔ مگر لاطینی زبان کے مقابلے میں اُس کی مذہبی اہمیت نہ ہونے کے برابر تھی۔ لہذا اُس پر توجہ بھی کم دی جاتی تھی۔ جہاں تک بائبل کا تعلق ہے، متن سے زیادہ اُس کی تاریخ پر زور دیا جاتا تھا۔ روایتی نظام تعلیم کے تقاضوں کے مطابق اس مدرسے میں سب سے زیادہ اہمیت نظم وضبط کو حاصل تھی۔ اُس کی خاطر بچوں کو جسمانی سزا دینے سے گریز نہیں کیا جاتا تھا۔ نظم وضبط کی خلاف ورزی کرنے والے طلبہ ناپسندیدہ قرار پاتے تھے۔

والٹیئر کو علم حاصل کرنے کا جنون تھا۔ وہ ذہین وفطین تھا۔ حافظہ قابل رشک تھا اور وہ اساتذہ سے بھرپور فائدہ اٹھانے پر تلا رہتا تھا۔ کتابوں سے اُس کو عشق تھا۔ صحت کی خرابی کا بہانہ کر کے وہ تفریح کے اوقات میں بھی مطالعے میں مصروف رہتا یا اساتذہ سے علم حاصل کرتا رہتا۔ ساتھی طلبہ اُس کا مذاق اڑاتے تو وہ جواب دیتا کہ ''ہر شخص کا اچھل کود کا اپنا اپنا طریقہ ہوتا ہے۔''

لوئی لی گرینڈ کے اِس مدرسے کے یسوعی اساتذہ کو شاید ہی کبھی ایسے شاگرد سے پالا پڑا تھا، جو سب کچھ جاننے کا مشتاق ہو۔ وہ خدمت اور نوجوانوں کو علم ودانش منتقل کرنے کے مذہبی جذبے سے سرشار اساتذہ تھے۔ لہذا وہ والتیئر کی بہت قدر کرتے تھے۔ اُس سے خاصی مہربانی سے پیش آتے اور اُس کی تعلیم وتربیت میں کوئی کسر نہ چھوڑتے تھے۔ خیر، ہم یہ یاد دلا دیں کہ ان باتوں کے باوجود وہ محض کتابی کیڑا یا ''پڑھاکو'' طالب علم نہ تھا۔ کوئی ذہین وفطین نوجوان پڑھائی میں گہری دلچسپی کے باوجود محض کتابوں تک محدود نہیں رہ سکتا۔ چنانچہ والتیئر کا معاملہ یہ ہے کہ اُس زمانے سے تعلق رکھنے والی اُس کی ذہانت اور شرارتوں کے کئی قصے مشہور ہیں۔

ایک قصہ یہ ہے کہ سرما کے دنوں میں مدرسے کے کمروں کو گرم کرنے کے لئے چولھے صرف اُس وقت جلائے جاتے تھے جب ایک خاص برتن میں رکھا ہوا مقدس پانی جم کر برف بن جاتا تھا۔ لاغر والتیئر کے لئے اس سے کم درجے کی سردی بھی تکلیف دہ ہوا کرتی تھی۔ چنانچہ کمرے گرم کروانے کے لئے اُس نے ایک ترکیب سوچی۔ چھپ کر وہ صحن سے برف کی ٹکڑیاں اکٹھی کرتا اور آبِ مقدس کے برتن میں ڈال دیتا۔ یوں مقدس پانی وقت سے پہلے ہی جمنے لگتا۔ والتیئر کی یہ چال آئندہ زندگی میں اُس کے وطیرے کی خبر دیتی تھی۔

مدرسے میں اُس نے ایک اور عادت سیکھی۔ یوں کہنا چاہیئے کہ عادت تو اس کو پہلے سے تھی اب اور بھی پختہ ہوگئی۔ اور زندگی بھر اُس کا شعار رہی۔ اس عارت کا تعلق پادریوں اور دوسرے مذہبی عہدہ داروں کا مذاق اڑانے سے تھا۔ اُس نے جواز بھی ڈھونڈ رکھا تھا۔ اُس کا کہنا تھا کہ یہ لوگ مذہبی لگن یا دوسروں کی خدمت کرنے کے پُر خلوص جذبے کے بجائے ذاتی مفادات حاصل کرنے کے لئے پادری بنتے ہیں۔ گویا یہ بھی ایک طرح کا کاروبار یا پیشہ ہے۔ اربابِ مذہب روحانیت اور اخلاقیات کی اعلیٰ اقدار کی آڑ میں فائدے حاصل کرتے ہیں۔

ایک بار چند ہم جماعت ساتھیوں نے مذاق اڑانے کے لئے یہ افواہ پھیلا دی کہ والتیئر اور اُس کے ایک دوست نے پادری بننے کا آپس میں عہد کیا ہے۔ یہ بات والتیئر تک پہنچی تو اُس نے سنجیدگی سے جواب دیا کہ '' دوستو میں تو دنیا دار ہوں۔ پادری کیسے بنوں گا۔ رہا میرا دوست تو وہ بہت دانا ہے۔ وہ ایسی احمقانہ حرکت نہیں کرے گا۔''

ان ساتھیوں کے بارے میں والٹیئر کے پہلے سوانح نگار ڈیورنٹ نے لکھا ہے کہ بعد کی زندگی میں کم وبیش وہ سبھی موحد بن گئے تھے۔ (یہاں ''موحد'' کی اصطلاح ہم نےDEISM کے حوالے سے استعمال کی ہے۔ یہ اٹھارہویں صدی کا ایک یورپی نظریہ تھا جس کے ماننے والے خدا پر ایمان رکھتے تھے اور اُس کو واحد سمجھتے تھے لیکن وحی کے منکر تھے اور سمجھتے تھے کہ خدا نے انسان کی رہنمائی کے لئے کسی نبی کو نہیں بھیجا۔ یہ لوگ فطری مذہب کے حامی تھے اور عقل کی بالا دستی کا اقرار کرتے تھے۔ آگے چل کر ہم اس بارے میں قدرے تفصیل سے بات کریں گے)۔ ڈیورنٹ صاحب نے یہ واقعہ بھی لکھا ہے کہ ایک دن کلاس روم میں ایک استاد'' فادر لیجے'' والٹیئر کی شرارتوں سے غصے میں آ گیا تو اُس نے شاگرد کو کالر سے پکڑا اور کہنے لگا ''بدمعاش، تم کسی دن فرانس میں موحدیت کے علمبردار بن جاؤ گے۔''

مدرسے میں والٹیئر نے علم حاصل کیا۔ شرارتیں کیں اور ساتھ ہی ساتھ شاعری بھی کی۔ طالب علمی کے زمانے سے اُس کی شاعرانہ صلاحیتیں ظاہر ہونے لگی تھی۔ اور شاعری نے اُس کو دوسروں سے نمایاں ہونے میں مدد دی۔ بارہ سال کی عمر میں وہ اچھی بھلی شاعری کرنے لگا تھی۔ یکم جنوری1710 کو لاطینی زبان میں نظم نگاری کے ایک مقابلے میں اُس کو پہلا انعام ملا تھا۔ سکول کے اساتذہ نے انعام میں دینے کے لئے تاریخ کی ایک کتاب منتخب کی جس کا عنوان''فرانس میں خانہ جنگیوں کی تاریخ'' تھا۔ ہمارے پاس ایسے شواہد موجود نہیں جن کی بنا پر یہ فیصلہ کیا جاسکے کہ آیا یہ محض اتفاق تھا یا اساتذہ نے یہ کتاب تاریخ میں اپنے اس ہونہار طالب علم کی دلچسپی کے باعث چنی تھی۔ بہرحال یہ طے ہے کہ تاریخ میں اُس کو عمر بھر دلچسپی رہی اور اُس نے تاریخی موضوعات پر بہت سی کتابیں، نظمیں اور ڈرامے لکھے۔

خیر، آغاز شباب کی والٹیئر کی شاعری کے بارے میں ایک دو اور باتیں بھی قابل ذکر ہیں جو اُس کی شخصیت کو جاننے میں مدد دیتی ہیں۔ پہلی بات یہ ہے کہ مدرسے کے اساتذہ اُس کی شاعری کی قدر کرتے تھے۔ چنانچہ انہوں نے والٹیئر کے نام کے ساتھ اُس کی شاعری شائع کی تھی۔ دوسرا قصہ یہ ہے کہ ایک روز ایک پریشان حال بوڑھا سابق فوجی مدرسے میں آ نکلا۔ اُس نے پادریوں سے درخواست کی وہ اُس کو ایسی نظم لکھ دیں جو وہ اپنے نواب (جس کی رجمنٹ میں وہ ملازم رہ چکا تھا) کو سنائے اور اُس سے کوئی انعام حاصل کر

سکے- پادری صاحبان نے انعام کے آرزو مند بوڑھے فوجی کو والتیئر کے پاس بھیج دیا- طالب علم والتیئر نے بوڑھے کی فرمائش پوری کردی- نواب صاحب نے نظم سنی تو بہت خوش ہوئے- انہوں نے بوڑھے فوجی کا وظیفہ مقرر کر دیا-

یسوعیوں کے اس مدرسے کی تربیت سے والتیئر کی شخصیت نکھر گئی- مہربان اساتذہ نے اُس کی تربیت میں کوئی کسر نہ چھوڑی- یوں اُس کی فطری صلاحیتوں کو چار چاند لگ گئے-

طالب علمی کے زمانے کا خاتمہ اگست 1711 میں ہوا- وہ مدرسے میں گزرے ہوئے دنوں سے مطمئن تھا- اور اساتذہ کے لئے ممنونیت کا احساس اُس کو زندگی بھر رہا- سکول چھوڑنے کے تیس پینتیس سال بعد اُس وقت کے پرنسپل کے نام ایک خط میں والتیئر نے لکھا تھا کہ ''سات برس تک میری پرورش ایسے صاحبان کرتے رہے جو نوجوانوں کے ذہن واخلاق کی تربیت میں دل وجان سے حصہ لیتے تھے- کیا کوئی سوچ سکتا ہے کہ میں اُن اساتذہ کے لئے احسان مندی کے احساس سے محروم ہوں-''

2

پہلی محبت

طالب علمی کے زمانے سے والتیئر کا تعلق چند آزاد خیال لوگوں کی ایک جماعت سے بن گیا تھا جس کو "ٹمپل گروپ" کا نام دیا جاتا ہے- یہ شاعروں، ادیبوں اور دانش وروں کا گروپ تھا- اُن کی قدرِ مشترک محض آزاد خیالی نہ تھی- ایک اور بات بھی اُن میں مشترک تھی وہ سب خوش باش اور زندہ دل لوگ تھے- ہنستے کھیلتے اور موج اڑانے والے تھے- اُس زمانے میں عام تاثر یہ تھا کہ آزاد خیال اور عقل کے متوالے پھسپھسی اور بے لطف زندگی گزارتے ہیں-ٹمپل گروپ کا معاملہ مختلف تھا- اُس نے یہ تصور جھٹلا دیا تھا-

یسوعی اساتذہ کی طرح ٹمپل گروپ نے بھی والتیئر کی ذہنی اور جذباتی تشکیل میں نمایاں حصہ لیا- گروپ نے اِس ذہین نوجوان کے دل میں فکر ونظر اور اظہار کی آزادی کی ایسی لگن پیدا کر دی جو ساری زندگی اُس کی شخصیت کا امتیازی عنصر رہی-

مدرسے سے فارغ ہونے کے بعد اس وقت کے رواج کے مطابق، مزید تعلیم کے لئے والتیئر کے سامنے دو راستے تھے- وہ الٰہیات کی تعلیم حاصل کرسکتا تھا یا پھر قانون کی- اُس کو دونوں پسند نہ تھے-مگر بیٹے کے مستقبل میں گہری دلچسپی رکھنے والا باپ اُس کو قانون کی تعلیم دلانا چاہتا تھا- والتیئر نے صاف انکار کر دیا- پختہ ارادے کے ساتھ اُس نے کہا:

"میں تو بس ادیب بنوں گا- کوئی اور کام مجھے پسند نہیں-"

سیانے باپ نے جواب دیا:

"یہ کام وہی کرتا ہے جو سماج کے لئے بے فائدہ اور والدین کے لئے بوجھ بننا چاہتا ہو

اور ساتھ ہی بھوکوں مرنا چاہتا ہو۔''

باپ نے ضرور بھانپ لیا ہوگا کہ اِس نوجوان کو قانون کی طرف راغب کرنا آسان نہیں جو کسی شے کا احترام کرنے پر تیار نہ ہو۔

والتیئر اب نوجوان تھا اور پیرس ایک رنگین شہر۔ اس شہر کی رنگینیاں اور خاص طور پر اعلیٰ طبقہ کی سرمستیاں اُس کو متوجہ کرنے لگی تھیں۔ دینی باپ نے ایک بار پھر ہاتھ پکڑا۔ اُس نے والتیئر کو اعلیٰ رتبوں والے لوگوں سے متعارف کرایا۔ ذہن وفطین نوجوان کے لئے بس تعارف ہی کافی تھا اس کے بعد وہ اپنے لئے جگہ خود بنا سکتا تھا۔ چنانچہ دیکھتے ہی دیکھتے وہ ذہانت، حاضر جوابی، طنز ومزاح کی لاجواب صلاحیت اور نکتہ سنجی کے باعث اعلیٰ طبقہ میں گھل مل گیا۔ یہ کوئی معمولی کامیابی نہ تھی۔ اُس زمانے کے اعلیٰ طبقے کے افراد رسوم ورواج اور تکلفات کے پابند تھے۔ وہ دوسرے طبقوں کے افراد سے فاصلہ رکھنے میں یقین رکھتے تھے۔ اس لیئے متوسط طبقے سے تعلق رکھنے والے والتیئر کے لئے اُن کی محفلوں تک رسائی پانا بہت دشوار تھا۔ بہر طور والتیئر ان محفلوں میں ہاتھوں ہاتھ لیا گیا۔ شہزادوں اور بڑے بڑے لوگوں سے اُس کا میل ملاپ ہونے لگا۔ فیشن ایبل خواتین سے ملاقات کا ایک اچھا بہانہ اُس نے ڈھونڈ لیا۔ وہ اُن کی شاعری کی اصلاح کرنے لگا۔ یوں اُن کی قربتیں میسر آنے لگیں۔ یہ زبردست آغاز تھا۔ اُس کی زندگی کے بہت سے ماہ وسال اپنی رنگین قربتوں میں بسر ہونے والے تھے۔

طنز ومزاح، حاضر جوابی اور جگت بازی سے کھلنڈرے طبقوں میں آگے بڑھنے میں مدد ضرور ملتی ہے لیکن بہت سے دشمن بھی پیدا ہو جاتے ہیں۔ کھیل ہی کھیل میں، دوستوں کے حلقوں میں، والتیئر کے مخالفین بھی پیدا ہونے لگے تھے۔ ذہانت سے حاصل ہونے والی خود اعتمادی کے باعث وہ طبقہ اشرافیہ کے اُن افراد کے ساتھ برابر کی سطح پر پیش آنے لگا تھا جو اُس کے دوست بن گئے تھے۔ واقعی وہ نوجوان تھا اور زندگی نے ابھی اُس کو تلخ حقیقتوں سے آشنا نہ کیا تھا۔ ابھی وہ اِن دوستوں کے تکبر کا نشانہ نہ بنا تھا۔

شاید وہ جلد ہی نشانہ بن جاتا۔ لیکن خوش قسمتی نے وقتی طور پر ساتھ دیا۔ اور والتیئر کو کچھ عرصہ کے لئے پیرس سے باہر جانے کا موقع مل گیا۔ اصل میں اُس کے دینی باپ کا ایک بھائی ہالینڈ میں فرانس کی طرف سے سفیر مقرر ہوا تھا۔ جب وہ ہیگ جانے لگا تو قاصد

کے طور پر والتیئر کو ساتھ لے گیا۔

پہلی ملازمت کے دن خاصے ہنگامہ خیز رہے۔ بات یہ ہوئی کہ ہالینڈ کے دارلحکومت پہنچتے ہی اُس کی مڈبھیڑ مادام این مارگریٹ دونوئرَ نامی ایک خاتون سے ہوگئی۔ وہ ایک فرانسیسی پروٹسٹنٹ عورت تھی جس نے شوہر سے بھاگ کر ہیگ میں پناہ لے رکھی تھی۔ وہ بیٹیوں کو ساتھ لی آئی تھی۔ شہر میں اُس کی شہرت اچھی نہ تھی۔ وہ ایک چالاک ادبی مہم باز عورت کے طور پر مشہور تھی۔ وہ ایک رسالے پر گزارہ کرتی تھی جس میں معزز لوگوں کے سکینڈل شائع کئے جاتے تھے۔ والتیئر کی گواہی یہ ہے کہ مادام ڈونوئرَ اعلیٰ طبقے کے افراد کے سکنڈل، حماقتیں اور جعلی چٹکلے جمع کرتی اور پھر اُن کو اپنے رسالے میں شائع کر دیتی تھی۔

والتیئر اِس چالاک عورت سے ملا اور ملتے ہی نفرت کرنے لگا۔ مگر ہوا یہ کہ اُس کی بیٹی اولمپی کے عشق میں مبتلا ہوگیا۔ وہ اکیس سال کی تھی اور اُس نے حال ہی میں ایک فرانسیسی افسر کے ساتھ رومان ختم کیا تھا جو اُس کو چھوڑ کر اپنا مقدر بنانے انگلستان چلا گیا تھا۔

مادام دونوئرَ کو بھلا والتیئر جیسے نوجوان میں کیا دلچسپی ہوسکتی تھی جس کا کوئی اعلیٰ خاندانی پس منظر تھا اور نہ ہی زندگی میں اس نے ابھی کوئی بڑا مقام حاصل کیا تھا۔ اُس نے فوراً سفیر صاحب سے شکایت کردی۔ نتیجہ یہ ہوا کہ سفارتی عملے کو کسی سکنڈل سے بچانے کے لئے سفیر نے والتیئر کے گھر سے باہر نکلنے پر پابندی عائد کر دی۔ نوجوان عاشق کو یہ پابندی کہاں تک روک سکتی تھی۔ راتوں کو وہ چھپ کر محبوبہ کے پاس پہنچ جاتا۔ ایک بار اُس نے اپنا لباس اولمپی کو بھیجا تا کہ وہ مردانہ کپڑے پہن کر پہرے دار کی آنکھوں میں دھول جھونکے اور اور اُس سے ملنے آجائے۔ وہ واقعی آ گئی۔ مگر پکڑی گئی۔ سفیر صاحب غصے سے بے قابو ہوگئے۔ انہوں نے والتیئر کو فوراً پیرس واپس بھیج دیا۔

یہ قصہ یہیں ختم نہیں ہوا۔ اپنے شہر لوٹ جانے کے بعد والتیئر نے محبوبہ کو اغوا کرنے کا منصوبہ بنایا۔ اغوا کے لئے اُس کے ہوشیار ذہن کو ایک نرالی ترکیب سوجھی، کیوں نہ جوشیلے یسوعی دوستوں سے مدد لی جائے! چنانچہ اُس نے اِن دوستوں کے مذہبی جذبات بھڑکائے۔ والتیئر نے اُن کو یقین دلایا کہ اولمپی دل سے رومن کیتھولک ہے مگر پروٹسٹنٹ ماں نے زبردستی اُس کو روک رکھا ہے۔ جیسا کہ توقع کی جاسکتی ہے، یسوعی اس، مذہبی بہن، کو بدعتی ماں کے قبضے سے چھڑانے کے لئے فوراً تیار ہوگئے۔ سفیر کو اس معاملے کی خبر ہوگئی۔ چنانچہ

اُس نے صاف بتلا دیا کہ یہ سب نوجوان عاشق کی کارستانی ہے- اگر لڑکی کو اغوا کرنے کی کوشش کی گئی تو ولندیزی حکومت کو سخت ناگوار گزرے گی- یوں یہ معاملہ ختم ہوگیا- بعد کی زندگی میں والٹیئر اور اولمپی کے مابین تھوڑا بہت تعلق رہا- والٹیئر اُس کو کبھی کبھار تحائف بھیجا کرتا تھا- کم از کم ایک بار اُس نے ضرورت کے وقت ایام شباب کی اس محبوبہ کی مالی مدد بھی کی تھی-

ہیگ سے نکل کر والٹیئر پیرس پہنچا تو گھر میں اُس کا گرم جوشی سے استقبال نہیں ہوا- وکیل صاحب والٹیئر کی حرکتوں کے باعث اُس سے خوش نہ تھے- ویسے وہ اپنے بڑے بیٹے سے بھی ناراض تھے- ایک بار انہوں نے کہا تھا کہ اُن کے دونوں بیٹے ہی نالائق نکلے ہیں- اُس زمانے کے فرانس میں ایک ایسا قانون موجود تھا جس کی رو سے کوئی باپ بیٹے کو قید کرنے یا اُس کو جلاوطن کرنے کا سرکاری اجازت نامہ حاصل کرسکتا تھا- وکیل صاحب نے والٹیئر کے لئے یہ اجازت نامہ حاصل کرلیا- اُس کو خبر ہوئی تو ڈر کے مارے چھپ گیا- باپ کو راضی کرنے کی خاطر اُس نے قانون کا مطالعہ شروع کرنے کا وعدہ بھی کرلیا-

یہ وعدہ پورا نہیں ہوا- والٹیئر پیرس کے امرا کی زندگی کی رنگینیوں سے خود کو دور نہیں رکھ سکتا تھا- وہ ایک بار پھر شاعری، جوا اور محبوباؤں سے دل بہلانے لگا- انہی دنوں مارکوئیس ڈی سینٹ انگے کی وساطت سے اُس کو فرانس کے بادشاہ، لوئی چہاردہم، کے دربار تک رسائی حاصل ہوگئی- والٹیئر نے یہاں بھی پھرتی سے کام لینا چاہا- وہ اہل دربار کی جاہ طلبی، ہوس اقتدار، حسد اور باہمی رقابتوں سے فائدہ اٹھا کر آگے بڑھنے لگا تو مارکوئیس نے اُس کو احتیاط سے کام لینے کو کہا- لیکن ساتھ ہی ساتھ وہ اس نوجوان کو دوسروں سے بچاتا بھی رہا- مگر جہاندیدہ اور ہمدرد مارکوئیس بھی اُس کو ایک شے سے نہیں بچا سکتا تھا اور وہ والٹیئر کی اپنی تیز وطرار زبان تھی-

1715 میں لوئی چہاردہم کا انتقال ہوگیا- اس کے ساتھ ہی فرانس پر ایک پاگل پن طاری ہوگیا- لگتا تھا کہ تمام بندشیں ٹوٹ گئی ہیں- پرانے جھگڑے پھر سے شروع ہوگئے- فرانس طبقوں اور فرقوں میں بٹا ہوا ملک تھا- لوئی چہاردہم کی سخت گیر پالیسیوں نے ان کے باہمی تضادات کو دبا رکھا تھا- وہ نہ رہا، تو یہ سارے تضاد کھل کر سامنے آنے لگے- امرا ایک دوسرے کی ٹانگیں کھینچنے لگے- اہل مذہب ایک دوسرے کے گریبان پکڑنے لگے- ادیب

ایک دوسرے پر کیچڑ اچھالنے لگے- ظالمانہ سیاسی اور سماجی نظام اور ٹیکسوں کو بھر مار نے عوام کی زندگی دوبھر کر رکھی تھی- وہ ایک امیر ملک کے شہری ہوتے ہوئے بھی بے بسی اور محرومی کی زندگی بسر کر رہے تھے- بادشاہ کی موت اور مختلف گروہوں کی باہمی آویزش کے باعث وہ اس غلط فہمی کا شکار ہوگئے کہ اُن کے مسائل حل ہونے کا وقت آ گیا ہے-

چودھویں لوئی کی موت کے بعد اُس کا ریجنٹ فلپ آف اور لینز اُس تمام نکتہ چینی، نفرت اور غصے کا ہدف بن گیا جو لوئی کے ظالمانہ عہد میں اظہار کی راہ نہ ملنے کے سبب دلوں میں اندر ہی اندر جمع ہو رہا تھا- بہت سے لوگوں نے سمجھا کہ بادشاہ کی موت اُن کے لئے آزادی کا پیغام لائی ہے- چنانچہ وہ اپنی جھنجھلاہٹ، غصہ، نفرت اور بے چینی کا کھلے بندوں اظہار کرنے لگے- چنانچہ حکومت کے خلاف بہت سے پمفلٹ منظر عام پر آ گئے- والٹیئر نے اس بہتی گنگا میں ہاتھ دھونے چاہے- چند پمفلٹ اُس نے بھی لکھ ڈالے- یار لوگوں نے بعض تیز و تند قسم کے گمنام پمفلٹ بھی اُس کے کھاتے میں ڈال دیے جو غالباً اُس نے نہ لکھے تھے- آپا دھاپی کے اِس ماحول میں والٹیئر نے ریجنٹ کے خلاف ایک ہجو بھی لکھ ڈالی-

پیمانہ لبریز ہوگیا- سینٹ سمن نے یہ واقعہ تفصیل سے لکھا ہے- وہ بتاتا ہے کہ نیا ریجنٹ آزادی پسند تھا- اپنے علاوہ دوسروں کی آزادی بھی اُس کو عزیز تھی- مگر ہجو کا معاملہ وہ بھی نہ دبا سکا- اور والٹیئر کو پیرس کے قدیم قلعہ کی جیل، باستیل میں قید کرنے پر مجبور ہوگیا-

مشہور ہے کہ جب اُس کو پکڑ کر لے جایا جا رہا تھا تو وہ پولیس افسروں کا مذاق اڑانے سے باز نہ آیا- طنزیہ ہمدردی کے لہجے میں کہنے لگا کہ پولیس والوں کے فرائض بہت کٹھن ہیں اور چھٹی کے دن (وہ اتوار کا دن تھا) بھی اُن سے مشقت لی جاتی ہے- اُس نے یہ بھی کہا کہ جیل میں اُس کو روزانہ دودھ ملے گا اور پندرہ دن سے پہلے اُس کو وہاں سے نکالا نہ جائے تو پھر وہ جیل میں بہت خوش رہے گا-

والٹیئر کے باپ کے لئے البتہ یہ خبر رنج دینے والی تھی- اُس کو باستیل کی جیل کی سنگینی کا احساس تھا- اُس نے کہا کہ باستیل میں اُس کا بیٹا زندہ درگور ہوجائے گا...... ''مجھے پہلے ہی ڈر تھا کہ اُس کی کاہلی کوئی رنگ لائے گی کاش اُس نے کوئی پیشہ اختیار کر لیا ہوتا-''

آج کے فرانس کی صورت حال کے حوالے سے دیکھیں تو چند شرارت آمیز شعروں

کے لئے یہ سزا ہم کو بہت سخت لگتی ہے۔ ہنسی کھیل میں دن گزارنے والے والتیئر پر، راستے کی چھیڑ چھاڑ کے باوجود، یہ سزا بہت کڑی گزری ہوگی۔ ہاں اُس کے دل میں اپنے ملک کے نظام کے بارے میں بہت سے شبہات بھی پیدا ہوئے ہوں گے۔ اور ہمسایہ برطانیہ کے لئے احترام بڑھ گیا ہوگا جہاں والتیئر کے زمانے میں بھی کسی شہری کو یوں بندی خانے میں نہیں پھینکا جاسکتا تھا۔

بندی خانے میں ایک نمایاں تبدیلی یہ آئی کہ اُس نے اپنا قلمی نام والتیئر رکھ لیا وہیں اُس نے اپنا پہلا بڑا دبی کارنامہ سرانجام دیا۔ یہ کارنامہ شاہ ہنری چہارم کی زندگی پر ایک طویل رزمیہ نظم کی صورت میں سامنے آیا۔ یہ ایک طویل نظم تھی، جس پر والتیئر نے بعد میں بھی کام جاری رکھا۔ وہ فرانس کا عظیم رزمیہ شاعر بننے کے خواب دیکھ رہا تھا۔

ایک سال سے زیادہ مدت کی قید کے بعد 11 اپریل 1718 کو والتیئر کو رہا کر دیا گیا۔

چند روز بعد والتیئر کی ریجنٹ سے مڈبھیڑ ہوگئی۔ اُس نے ہنستے ہوئے شاعر کا استقبال کیا۔ وہ دل کا بُرا نہ تھا اور نہ ہی اُس کے دل میں نوجوان باغی شاعر کے لئے کوئی کدورت تھی جس کو ایک ہجو کے باعث اُس نے پس دیوار زنداں بجھوایا تھا۔

''حضور والا'' والتیئر اُس سے مخاطب ہوا۔ ''آپ میرے کھانے پینے کا انتظام کر دیں تو مجھے بہت خوشی ہوگی۔ مگر جناب میں اپنی رہائش کی فکر خود کر لوں گا۔''

3

دوسری قید

رہائی مستقل نہ تھی۔ مہیب باستیل کے دروازے جلد ہی ایک بار پھر والتیئر کے لئے کھلنے والے تھے۔ خیر پہلی رہائی کے بعد والتیئر کو پیرس میں رہنے نہ دیا گیا اور ایک سال کے لئے شہر بدر کر دیا گیا۔ اُس نے موقع غنیمت جانا اور ایک امیر دوست کی دیہی حویلی چلا گیا۔ قید نے اُس کی صحت پر بُرا اثر ڈالا تھا۔ تازہ ہوا اور قدرتی ماحول اُس کے لئے مفید ہوسکتے تھے۔ لہذا گاؤں کی حویلی کا رخ کرنے کا فیصلہ ٹھیک ہی تھا۔ اُس نے وہاں ایک محبوبہ بھی جلد ہی ڈھونڈ لی جو تھیٹر میں کام کرنے کی آرزومند تھی۔

خود والتیئر بھی ڈرامے کی طرف زیادہ مائل ہو رہا تھا۔ ریجنٹ پر چوٹ کرنے کی خواہش بھی دل میں مچل رہی تھی۔ جس کے بارے میں یہ سکینڈل مشہور ہو رہا تھا کہ اُس کے اپنی بیٹی کے ساتھ جنسی تعلقات ہیں۔ والتیئر کو چوٹ لگانے کا موقع مل گیا۔ اُس نے اپنا پہلا مشہور ڈرامہ ''ایڈی پس'' لکھا۔ یہ کوئی نیا کھیل نہیں تھا بلکہ قدیم یونان کے المیہ کھیلوں میں سے سب سے مشہور کھیل تھا۔ اس کو سوفوکلیز نے لکھا تھا۔ بعد میں کئی اور ڈرامہ نگاروں نے اس کے مرکزی خیال پر طبع آزمائی کی تھی۔ فرانس میں والتیئر سے پہلے 1679 میں ڈریڈن اور لی نے اس کو اپنے انداز میں لکھا تھا۔

''ایڈی پس'' کا نام فرائیڈ کے حوالے سے بھی بہت مشہور ہوا ہے اصل میں یہ تھیبس

کے بادشاہ ایڈی پس کی کہانی ہے جس نے سابق بادشاہ کو قتل کر کے اُس کی بیوہ جوکاسٹا سے بیاہ کرلیا تھا۔ بعد میں ایڈی پس پر یہ المناک انکشاف ہوا کہ وہ خود مقتول بادشاہ لیوس کا بیٹا ہے اور جس عورت سے اس نے شادی کی ہے وہ اُس کی ماں ہے۔

والتیئر نے بدنصیب ایڈی پس کا کھیل اپنے انداز میں لکھا اور ریجنٹ کو ایک خط بھیج دیا جس میں یہ کھیل اُس سے معنون کرنے کی اجازت مانگی گئی تھی۔ خط میں اُس نے خود کو ''شعبہ حماقت کا سیکرٹری'' بیان کیا تھا۔ اصل میں یہ ریجنٹ کے ساتھ اس کے ایک مکالمے کی طرف اشارہ ہے۔ ایک بار ریجنٹ کونسل کے اجلاس کے بعد اپنے چار نائب سیکرٹریوں کے ساتھ باہر نکل رہا تھا تو اُس کا آمنا سامنا والتیئر سے ہوگیا۔ اس موقع پر ریجنٹ نے مذاق کے طور پر کہا تھا کہ ''والتیئر میں تم کو بھولا نہیں ہوں۔ حماقت کے محکمہ کے نہ تم میرے ذہن میں ہو۔'' منہ پھٹ والتیئر نے فوراً جواب دیا ''جناب پھر تو میرے بہت سے رقیب ہوں گے۔ چار تو ابھی آپ کے ساتھ ہیں۔''

''ایڈی پس'' میں والتیئر نے پہلی بار ایک ایسی تکنیک استعمال کی جو عمر بھر اُس کے کام آتی رہی۔ یہ تکنیک مذہب کے نمائندوں پر اس انداز سے چوٹ کرنے سے تعلق رکھتی تھی جس سے سب لوگوں کو اُس کے ہدف کا پتہ چل جائے اور وہ خود مذہبی احتساب کی گرفت میں آنے سے بچ بھی جائے۔ چنانچہ اِس ڈرامے میں بظاہر اُس نے قدیم یونان کے مشرکانہ عقیدوں اور دیوتاؤں کا مذاق اڑایا ہے۔ لیکن صاف ظاہر ہوجاتا ہے کہ اُس کے اپنے زمانے کے مسیحی عقاید اور اہل کلیسا نشانہ بن رہے ہیں۔

یہ کھیل پیرس میں سٹیج ہوا۔ یہ وہ دارالحکومت تھا جس میں رنگ رلیاں عروج پر تھیں ساتھ ہی ساتھ اس کے مزاج میں بغاوت کا عنصر بھی بڑھتا جارہا تھا۔ نوجوان مصنف کے بارے میں سب جانتے تھے کہ وہ باغی ہے شہر کے قلعہ میں بند رہ چکا ہے۔ یہ بات بھی ڈھکی چھپی نہ تھی کہ یہ کھیل پادریوں بلکہ مذہب پر بھی ایک طنز ہے۔ بہت سے لوگوں نے یہ اندازہ بھی کرلیا تھا کہ مصنف نے ایڈی پس کا موضوع اصل میں ریجنٹ صاحب پر طنز کے لئے چنا ہے جس نے اُس کو جیل بجھوایا تھا۔ یوں کھیل شروع ہوا تو ٹھٹ کے ٹھٹ لگ گئے۔ مقبولیت کا یہ عالم تھا کہ یہ ڈرامہ ڈیڑھ ماہ تک ہر رات سٹیج ہوتا رہا۔ اُس زمانے میں یہ ایک ریکارڈ تھا جس کو کورینل اور رسین جیسے بڑے ڈرامہ نگاروں کے کھیل بھی قائم نہ کر سکے تھے۔

بغاوت کے زمانے میں یہ ایک باغی کا کھیل تھا جس کے لئے لوگوں نے بے شمار تالیاں بجائیں اور بے پناہ داد دی- پیرس نے والتیئر کو ڈرامہ نگار مان لیا تھا- پھر یہ ہوا کہ ایک رات خود ریجنٹ بھی اپنی بیٹی کو ساتھ لئے کھیل دیکھنے آ گیا-

شاندار کامیابی کے سامنے واقعی کون ٹھہر سکتا ہے- چاروں طرف والتیئر کے گن گائے جا رہے تھے- فطری بات ہے کہ اس ماحول میں حاسد بھی پیدا ہوگئے- اور بعض نے ڈرامہ نگار پر ہتک عزت کے مقدمے بھی کر دیے- انہی دنوں اچانک شہر میں ریجنٹ کے خلاف ایک بے ہودہ گمنام نظم کا چرچا ہونے لگا- انگلیاں والتیئر کی طرف اٹھنے لگیں- نظم اُس سے منسوب کر دی گئی- یہ الزام درست نہ تھا- مگر اُس کو غلط ثابت کرنا مشکل تھا- والتیئر کے دشمن ریجنٹ کے کان بھر رہے تھے اور اُس کو باستیل کی ایک اور سیر کروانے کو کہہ رہے تھے- ریجنٹ کو شاید اُس کی صلاحیتوں کا اندازہ ہوگیا تھا- ہوسکتا ہے کہ اُس کے دل میں کوئی نرم گوشہ بھی پیدا ہوگیا ہو- چنانچہ اُس نے حاسدوں کی بات نہ مانی-

معلوم ہوتا ہے کہ والتیئر صرف مخالفوں پر چوٹ لگانے میں ہی ہوشیاری سے کام نہ لیتا تھا بلکہ اُس کو اپنے مستقبل کا بھی خیال رہتا تھا- چنانچہ ''ایڈی پس'' اور اُس کے بعد بعض دوسرے ڈراموں کی کامیابی سے اُس کو جو رقم حاصل ہوئی وہ اُس نے ہوشیاری سے کاروبار میں لگادی- ایک بار جب حکومت نے لاٹری کا اعلان کیا تو اس نے بڑی چالاکی سے منتظمین کی آنکھوں میں دھول جھونکتے ہوئے لاٹری کے تمام ٹکٹ خرید لئے- نتیجہ یہ ہوا کہ سارے انعام اُس کو جھولی میں آ گرے- اس قسم کی دنیاوی دانش کے باعث اُس کی ساری زندگی آسائش میں گزری اور کبھی اس کو روپے پیسے کی کمی کا مسئلہ پیش نہ آیا- یوں اس نے باپ کا یہ دعوی غلط کر دکھایا کہ ادیب لوگ عمر بھر دوسروں پر بوجھ بنے رہتے ہیں اور بھوکوں مرتے ہیں-

والتیئر کو اب پیرس واپس آنے کی باقاعدہ اجازت مل گئی تھی- مگر یہ شہر اُس کی نظروں سے گر چکا تھا- چنانچہ اُس نے ایک دوست کو خط میں لکھا تھا کہ'' میں جب پیرس کے منحوس شہر میں ہوتا ہوں تو لگتا ہے کہ جیسے دوزخ میں آ گیا ہوں-'' ایک اور دوست کو اُس نے لکھا تھا کہ'' میں دیہاتوں اور جنگلوں میں رہنے کے لئے پیدا ہوا تھا- شہروں میں رہنا مجھے راس نہیں آتا-''

شہر میں بے پناہ شہرت حاصل کرنے کے بعد وہ سلی میں اپنے دوست کی حویلی کو لوٹ گیا- اس حویلی کی زندگی شہر کی رنگینیوں سے کم نہ تھی- محبوبہ وہیں تھی اور دوستوں کا ہجوم بھی رہتا تھا- وہ لطیفے گھڑتا، سب سنتے اور ہنستے تھے- وہ المیے لکھتا اور پڑھ کر سناتا- ہر کوئی آنسو بہاتا تھا- اُس کے دن خوب گزر رہے تھے- وہ سوچتا کہ وہ خوش نصیب ہے- اس کو اچھا زمانہ اور اچھے دوست ملے ہیں- خوشیاں اور شرارتیں اس کا پیچھا کر رہی ہیں-

زندگی کا یہ روپ اچانک ہی بگڑ گیا-

ایک شام والتیئر اوپیرا میں دوستوں کے ساتھ خوش گپیوں میں مصروف تھا کہ شوہر دو روہن کسی بات پر بگڑ گیا- وہ امرا کے طبقے سے تعلق رکھنے والے ایک بڑے گھرانے کا نا اہل بیٹا تھا- اُس میں کوئی ذاتی خوبی نہ تھی- بس ایک بڑا نام بزرگوں سے اُس کو مل گیا تھا- شوہر نے توہین آمیز لہجے میں پوچھا:

''والتیئر تمہارا اصل نام کیا ہے؟''

والتیئر نے اس پر ایک نگاہ ڈالی اور جواب دیئے بغیر اپنی باتوں میں مصروف ہوگیا- مگر شوہر یوں نظر انداز کئے جانے کو برداشت کرسکتا تھا- وہ دوبارہ گرجا:

''سنا تم نے، میں کیا پوچھ رہا ہوں-''

وہ بدتمیزی سے چیخا-

والتیئر جوابی حملہ کے لئے تیار ہوچکا تھا:

''مائی لارڈ'' اس نے جواب دیا- ''جو نام مجھے ملا وہ بس برائے نام ہی تھا- ہاں یہ ضرور ہے کہ میں نے اُس کو عزت واحترام عطا کیا ہے-''

اس چوٹ پر شوہر غصے سے لال پیلا ہوگیا- وہ اٹھا اور محفل سے نکل گیا- دو چار روز بعد وہ اپنے غنڈے لے کر آیا- انہوں نے والتیئر کو سبق سکھا دیا- جب غنڈے پیٹ رہے تھے تو شوہر مزے سے یہ نظارہ دیکھ رہا تھا- ایک مرتبہ اُس نے غنڈوں کو یہ ہدایت دی کہ ''اس کے سر پر چوٹ نہ لگانا- شاید اس سے کوئی اچھی بات نکل آئے-''

والتیئر نے یہ واقعہ اپنے میزبان ڈیوک کو سنایا اور اُس کی مدد چاہی- وہ ہنسی میں ٹال گیا-

یہ واقعہ اہم ہے- اس نے والتیئر کو اُس کی اوقات یاد دلا دی- وہ ذہن وفطین تھا-

شاعر، ادیب اور ڈرامہ نگار تھا- چاروں طرف اُس کی شہرت تھی تو کیا ہوا- تھا تو وہ ایک بوژوا جو جاگیر دار سماج میں رہ رہا تھا- اُس کو وہ مقام اور مراعات نہ مل سکتی تھیں جو امرا کو حاصل تھیں- چنانچہ اس کو پیٹا گیا اس کی توہین کی گئی- مگر اس کو انصاف نہ مل سکتا تھا-

جھنجھلاہٹ کے عالم میں اُس نے شوہر کو ڈویل لڑنے کا چیلنج دے ڈالا- شوہر ڈر گیا- اُس نے سوچا کہ اِس کم بخت کی تلوار اُس کی زبان کی طرح تیز ہوسکتی ہے- چنانچہ اُس نے پولیس کے سربراہ سے شکایت کی جو اُس کا کزن تھا- والتیئر کو قید کر لیا گیا اور ''باغیانہ گفتگو اور بے ہنگم طرزِ عمل'' کے الزام میں جیل میں بند کر دیا گیا-

خدا ہی جانتا ہے کہ اس ہتک آمیز زیادتی پر والتیئر کے دل پر کیا گزر رہی ہوگی- مگر ہم یہ جانتے ہیں کہ اُس کو دنیا کی بے انصافی، حماقت، انسانی عداوتوں اور اُن سب پر خدا کی خاموشی سے پالا پڑا- یہ ایسے زبردست احساسات ہیں جو شاہکاروں کو جنم دے سکتے ہیں-

4

جلاوطنی

توہین آمیز سلوک کے بعد بندی خانے میں پھینک دیئے جانے سے والتیئر کو یقین ہوگیا کہ وہ اپنی وطن میں نہیں رہ سکتا جہاں ظلم اور بے انصافی کا چلن ہے- اُس نے ملک سے نکل کر برطانیہ چلے جانے کا پختہ ارادہ کرلیا- چنانچہ اُس نے جیل خانے سے حکومت کو یہ درخواست دی کہ اس کو برطانیہ جانے کی اجازت دے دی جائے- یہ درخواست فوراً ہی اس شرط کی ساتھ منظور کر لی گئی وہ پیرس سے دُور رہے گا-

اس طرح باستیل میں چند روزہ قید کے بعد اس کو آزاد کر دیا گیا- تب اس نے پھرتی سے کام لیا- پیرس کی خطاب یافتہ دوستوں اور اچکوں کو خدا حافظ کہا اور لندن جا پہنچا- وہ انگلستان کے بادشاہ کی سالگرہ کے دن لندن پہنچا تھا جہاں دریائے ٹیمز کے کناروں پر جشن منایا جارہا تھا- والتیئر یہ منظر دیکھ کر بہت خوش ہوا- جلد ہی اس نے حیرت انگیز طور پر خود کو نئے ماحول سے ہم آہنگ کرلیا-

یہ بات کم وبیش یقین کے ساتھ کہی جاسکتی ہے کہ لندن جانے کا فیصلہ کسی جذباتی لمحہ کا نتیجہ نہ تھا اور نہ ہی اس کی بنیادی مقصد قید سے رہائی پانا تھا- اس زمانے کا برطانیہ سیاسی، سماجی اور مذہبی آزادی کے اعتبار سے نہ صرف یورپ بلکہ پوری دنیا کے لیئے بہترین نمونہ تھا- ملک میں شخصی حکومت ختم ہوچکی تھی- ایک بااختیار پارلیمنٹ موجود تھی- سماجی طبقے

موجود تھے- مگر بالائی طبقے کو وہاں کسی شہری کو عدالت کے حکم کے بغیر پس دیوار زنداں نہیں پھینکا جاسکتا تھا-

اُس زمانے کی والتیئر کی تحریروں سے یہ اندازہ لگانا دشوار نہیں کہ وہ انگریزوں کے ملک کے بارے میں کیا رائے رکھتا تھا- چنانچہ ''بروٹس'' نامی ایک ڈرامے میں اس نے اپنے ملک کے ساتھ برطانیہ کا موازنہ کیا ہے- وہ کہتا ہے کہ برطانیہ آزادی کی علامت ہے- انہی دنوں ایک ہم وطن دوست کو خط میں اس نے لکھا تھا کہ ''انگریز ایسی قوم ہیں جس کو سب سے زیادہ اپنی آزادی عزیز ہے- وہ فلسفیوں کی قوم ہے- مانا کہ اس قوم میں چند احمق بھی ہیں اور ہوسکتا ہے کہ فرانسیسی حماقت انگریزی حماقت سے زیادہ پر لطف ہو، لیکن خدا کی قسم انگریزی دانش اور انگریزی دیانت تمہاری دانش اور تمہاری دیانت سے کہیں زیادہ اعلیٰ ہیں-''

بار بار وہ اس حقیقت پر زور دینے لگا تھا کہ انگریزوں کے ملک میں سب لوگوں کو مذہبی آزادی حاصل ہے- جس کا جو جی چاہتا ہے، عقیدہ رکھتا ہے- مذہب ہر کسی کا نجی معاملہ ہے- لوگ ایک دوسرے کے عقیدوں میں دخل نہیں دیتے- وہاں کوئی کافر ہے نہ مومن- سب انسان ہیں- اختلاف کے باعث وہ ایک دوسرے کے گلے نہیں کاٹتے بلکہ احترام کرتے ہیں- والتیئر نے ایک بار انگریزی قوم کی مثال بیئر کے بیرل سے دی تھی جس کا بالائی حصہ جھاگ ہوتا ہے، زیریں حصہ تلچھٹ، درمیانی حصہ بہترین ہوتا ہے- اس سے مراد یہ تھی کہ انگریزوں کے اعلیٰ طبقے کے اختیارات محدود ہیں- عوام کی حالت زیادہ اچھی نہ سہی لیکن ان کا درمیانہ طبقہ بہترین ہے- ایک دوست کو اس نے لکھا تھا کہ'' میں جانتا ہوں کہ یہ وہ ملک ہے جس میں فنون کی عزت کی جاتی ہے اور فن کاروں کو ان کے فن کا صلہ ملتا ہے- یہ وہ ملک ہے جس میں لوگ آزادی اور وقار سے سوچتے ہیں- ان کو کوئی خوف لاحق نہیں ہوتا-''

والتیئر 32 سال کی عمر میں1726 میں لندن گیا اور وہاں اس نے رضا کارانہ جلا وطنی کے تین سال گزارے- پیرس سے روانگی کے وقت برطانوی سفیر نے اس کو کئی ممتاز افراد کے نام تعارفی خطوط دیئے تھے- اس زمانے کے مشہور انگریز شاعر الیگزنڈر پوپ کے ساتھ اس کی پہلے سے خط وکتابت تھی والتیئر نے اس کو اپنی ایک رزمیہ نظم بھیجی تھی- پوپ اپریل1724 تک اس کا پہلا مسودہ پڑھ چکا تھا اور والتیئر کی شاعرانہ صلاحیتوں کے متعارف

ہو چکا تھا- اس کے علاوہ لندن میں اس کا ایک با اثر دوست لارڈ بلنگ بروک بھی تھا جس سے فرانس میں قیام کے دوران شناسائی ہوئی تھی- والتیئر کو توقع تھی کہ لارڈ بولنگ بروک کے ذریعے اس کو لندن کی اعلیٰ سوسائٹی تک آسانی سے رسائی مل جائے گی- بہرحال سب سے زیادہ اس کو سوچنے، بولنے اور لکھنے کی آزادی درکار تھی اور وہ جانتا تھا کہ یہ آزادی اس کو انگریزی رواداری کی فضا میں مل جائے گی-

دراصل والتیئر بھی انگریزوں کے بارے میں پائے جانے والے عمومی تاثر سے گہرا متاثر ہوا تھا- اٹھارہویں صدی کے ابتدائی عشروں میں فرانس میں آزاد خیال لوگ یہ سمجھتے تھے کہ سمندر پار کے انگریزوں نے مذہبی تنگ نظری، جہالت اور تعصّبات سے نجات پائی ہے-بعض دانش ور تو یہاں تک دعوی کرنے لگے تھے کہ برطانیہ میں خود مذہب کا ہی خاتمہ ہوگیا ہے- لوگوں کو آزادی مل گئی ہے-نفرتیں اور کدورتیں ختم ہوگئی ہیں اور سب لوگ محبت اور امن سے مل جل کر رہنے لگے ہیں

مونٹیسکو اس زمانے کا مشہور دانش ور تھا- وہ خاص طور پر اس تاثر کو پھیلایا کرتا تھا- اس کا مقصد یہ تھا کہ انگلستان کی مثال دے کر وہ اپنے ملک میں بھی مذہبی نفرتوں کو کم کرنے کی طرف توجہ دلائے- اس کا کہنا تھا کہ ''برطانیہ میں مذہب کا خاتمہ ہوگیا ہے- اگر کوئی شخص وہاں مذہب کا ذکر کرتا ہے تو دوسرے اس کا ٹھٹھا اڑاتے ہیں-''

اس دعوی میں مبالغہ موجود ہے- مگر وہ بالکل بے بنیاد نہیں ہے- اس زمانے کے انگلستان میں سب لوگ نہ سہی، لیکن ادیبوں، دانش وروں اور امرا و شرفا کا ایک ایسا حلقہ وجود میں آچکا تھا جو مذہب سے بے زار تھا اور اس کو انسان کے لئے مصائب اور غلامی کا باعث خیال کرتا تھا البتہ عوام میں مذہب کا اثر ورسوخ قائم تھا- تاہم یہ ضرور ہے کہ کلیسائے انگلستان پیرس کے جین سنسٹ چرچ کے مقابلے میں بہت زیادہ روا دار تھا- مختلف مسیحی فرقوں کی باہمی آویزش سرد پڑ چکی تھی- نفرتیں ختم ہو رہی تھیں- مسیحیت کو معقولیت کی صورت دی جارہی تھی- لہذا مذہبی اختلافات کو صبر وحوصلہ اور برداشت کے ساتھ قبول کرنے کی فضا تیار ہوگئی تھی- مجموعی اعتبار سے تحمّل، رواداری اور مصالحت کا ماحول پیدا ہوگیا تھا- عام لوگ مذہبی ہوتے ہوئے بھی بُردباری کا دامن نہ چھوڑتے تھے- یہاں تک کہ مذہبی جوش وخروش والے فرقے بھی نرم پڑ چکے تھے- بعد ازاں ویلسلے کے زمانہ میں مذہب کو ایک بار پھر

جذباتی قوت حاصل ہوئی- یہاں تک کہ اٹھارہویں صدی کے آخری برسوں میں فرانسیسی انقلاب کے باعث مذہب سیاسی اور قدامت پسند قوت بن کر نمایاں ہوا-

یہ تھا وہ ماحول جس میں والتیئر نے قدم رکھا-

لندن پہنچتے ہی اس کو دو ناخوش گوار خبریں ملیں- ایک یہ کہ اس کی بہن فوت ہوگئی تھی اور دوسری یہ کہ جس بنکار کے ذریعے اس نے اپنی رقم لندن تک پہنچانے کا انتظام کیا تھا، وہ دیوالیہ ہوگیا تھا- دونوں خبریں اس کے لئے صدمے کا باعث بنیں- ایک اور پریشان کن بات یہ ہوئی کہ لارڈ بولنگ بروک نے آنکھیں پھیر لیں- والتیئر کو برطانیہ میں قیام کے دوران اس سے ہر قسم کی مدد حاصل ہونے کی توقع تھی- وہ خاص طور پر لارڈ کے وسیلے سے لندن کی اعلیٰ سوسائٹی میں داخل ہونا چاہتا تھا- مگر لارڈ صاحب اس وہم میں مبتلا ہو گئے کہ فرانس سے آنے والا یہ جواں سال باغی اصل میں اپنے ملک کا سیاسی ایجنٹ ہے- لہذا وہ اس سے دامن بچانے لگے-

خیر بعض دوسرے لوگ اس کو ہاتھوں ہاتھ لینے لگے- وہ لارڈ جیسے بااثر نہ تھے مگر انہوں نے کئی سہولتیں مہیا کردیں- والتیئر اپنی عادت کے مطابق انگریزوں کے وطن میں بھی مالدار دوستوں کے گھروں میں رہا- خاص طور پر فالکنز نامی ایک بڑے تاجر نے اس کی خوب مہمان نوازی کی- اور اس کو لندن سے چند میل دور اپنی حویلی میں رکھا- والتیئر نے اپنا مشہور المیہ کھیل ''زائرے'' کا انتساب ایسی مہربان تاجر کے نام کیا ہے- یہ پہلا موقع تھا کہ کوئی فرانسیسی ادب پارہ کسی تاجر کے نام معنون کیا گیا- بلاشبہ اس زمانے کے ماحول میں اس اقدام کے لئے والتیئر جیسی جرات درکار تھی-

فالکنز اپنے مہمان کو امرا کی محفلوں تک نہ لے جاسکتا تھا- البتہ اس نے والتیئر کو انگلستان کا تجارتی ماحول دیکھنے کے کئی مواقع فراہم کئے- اس نے یہ بھی دیکھا کہ پارلیمنٹ میں تاجر طبقے کو بہت اثر ورسوخ حاصل ہے اور یہ وہ بات تھی کہ جس کا اٹھارہویں صدی کے فرانس میں تصور بھی دشوار تھا-

معلوم ہوتا ہے کہ روپے پیسے کی جو محبت والتیئر کے دل میں پہلے سے تھی اور جو اس کو اپنے دنیا دار باپ سے ورثے میں ملی تھی، وہ فالکنز کی صحبت کے باعث بڑھ گئی- وطن واپس جانے کے بعد اس نے اس تجربے سے فائدہ اٹھایا اور باپ کی طرف سے وراثت میں ملنے

والی رقم کی کمال ہوشیاری سے سرمایہ کاری کی یہاں تک کہ اس کے وارے نیارے ہو گئے۔ یہاں تک کہ بسا اوقات یہ کہا جاتا ہے کہ والتیئر نے اس قدر دولت کمائی تھی کہ شاید ہی کسی اور مصنف نے زندگی میں کمائی ہو۔

والتیئر نے اپنی یادداشتوں میں اس معاملے کا ذکر کیا ہے۔ وہ لکھتا ہے کہ ”میں امیر پیدا نہیں ہوا تھا بلکہ میرے گھرانے کا تعلق متوسط طبقے سے تھا۔ لوگ مجھ سے پوچھا کرتے ہیں کہ میں نے اس قدر دولت کیسے حاصل کر لی ہے۔ میں اس امر کی وضاحت کرنا چاہتا ہوں تاکہ دوسرے لوگ میری مثال سے فائدہ اٹھا سکیں۔ میں نے بہت سے ادیبوں کو اس قدر مفلس اور گھٹیا حالت میں دیکھا تھا کہ اس نے ارادہ کر لیا کہ میں ان کی تعداد میں اضافہ کا باعث ہرگز نہ بنوں گا۔ چھوٹی سی وراثت روز بروز مزید چھوٹی ہوتی چلی جاتی ہے کیوں کہ بالآخر تمام چیزوں کی قیمتیں بڑھ جاتی ہیں اور حکومت بھی لوگوں کے سرمائے پر ہاتھ ڈالتی ہے۔ تاہم ایسا کوئی نہ کوئی راستہ ہمیشہ موجود ہوتا ہے جس کے ذریعے عقل مند لوگ اپنی رقم کو بچانے اور بڑھانے کے قابل ہو جاتے ہیں۔“

یہاں لمحہ بھر کو رک کر ہم اس بات کا اضافہ کر دیں کہ وہ غریب کبھی نہ تھا۔ لیکن حالات اس کے لئے سخت رہے تھے۔ وہ روپے پیسے کی فکر نہ کرتا تھا مگر اس نے اپنے سرمائے کی حفاظت کرنے اور اس کو بڑھانے کا سبق سیکھ رکھا تھا۔ آخر کار وہ آسودہ زندگی بسر کرنے کے قابل ہو گیا۔ تب اس نے اپنے خاندان کی مدد کی اور ضرورت مند دوستوں کو بھی فراموش نہ کیا۔ چند سال پہلے اس کے گھریلو حساب کتاب کی چند تفصیلات منظر عام پر آئی تھیں۔ ان سے معلوم ہوتا ہے کہ 1759 سے 1768 تک کے دس برسوں میں اس نے دس لاکھ سے زیادہ فرانک خرچ کئے تھے۔ یہ اس زمانے میں بڑی رقم تھی۔

آیئے ہم انگلستان میں والتیئر کے پاس واپس چلیں۔ لندن قیام کی زمانے میں وہ کئی مشہور انگریز ادیبوں سے ملا تھا۔ غالباً سب سے زیادہ متاثر اس کو جوناتھن سوفٹ نے کیا تھا جس کی شاہکار کتاب ”گلیور ٹریولز“ چند ہی سال پہلے شائع ہوئی تھی اور اس نے تہلکہ مچا دیا تھا۔ سچ تو یہ ہے کہ اس کتاب کے اثرات والتیئر کی بہت سی تحریروں میں صاف طور پر دیکھے جا سکتے ہیں۔ اس کی ایک مشہور کتاب ”مائیکرومیگاس“ ”گلیور ٹریولز“ کے گہرے مطالعے کے بغیر لکھی ہی نہ جا سکتی تھی۔ والتیئر نے اس کتاب میں انسانوں کے اس گھمنڈ پر

وار کیا ہے کہ وہ کائنات کی اہم ترین مخلوق ہیں یا بقول ان کے اشرف المخلوقات ہیں اور کائنات میں ان کی حیثیت مرکزی ہے۔

مائیکرو میگاس دو مختلف سیاروں سے تعلق رکھنے والے دو افراد کی کہانی ہے جو کائنات کے مختلف حصوں میں آوارہ گردی کرتے ہوئے اس سیارے پر آ نکلتے ہیں جس کو ہم زمین کہتے ہیں اور کائنات کا مرکز قرار دیتے ہیں۔ ان دو کرداروں میں سے ایک مائیکرو میگاس سے جو کلب الجبار سے آیا ہے اور جس کا قد پانچ لاکھ فٹ ہے۔ دوسرے کے متعلق یوں سمجھیئے کہ وہ غریب ٹھگنا ہے کیونکہ اس کا قد صرف پندرہ ہزار فٹ ہے اور وہ زحل سیارے کا باشندہ ہے۔ جب وہ دونوں زمین پر آتے ہیں تو ایک ''گڑھے'' میں سے گزرنے کا اتفاق ہوتا ہے جس کو بحیرہ روم کا نام دیا جاتا ہے۔ یہاں وہ ایک جہاز دیکھتے ہیں جو ایک قطبی مہم کے بعد فلسفیوں کو واپس لا رہا ہے۔ مائیکرو میگاس کے لئے جہاز اس قدر چھوٹا ہے کہ خوردبین کے بغیر اس کو دکھائی نہیں دیتا۔ غور سے دیکھنے کے لئے وہ بحیرہ روم سے جہاز کو اٹھاتا ہے اور اپنی ایک انگلی کے ناخن پر رکھ لیتا ہے۔ تب اس کو جہاز کے عرشے پر چیونٹیاں سی رینگتی محسوس ہوتی ہیں۔ وہ حیران ہو کر ان کو دیکھتا ہے۔

جلد ہی اس کی حیرت طنزیہ ہنسی میں بدل جاتی ہے۔ کیونکہ وہ چیونٹی جیسے حقیر ذرے اس کو بتاتے ہیں کہ وہ اشرف المخلوقات ہیں۔ ان کے اندر لافانی روح ہے اور یہ کہ کائنات کے بنانے والے نے ان کو اپنے نمونے پر بنایا ہے۔ یہی نہیں بلکہ اس ساری کائنات کی تخلیق انہی کی خاطر ہوئی ہے۔

اس قسم کی باتیں سن کر دور دراز سیاروں سے آنے والے آوارہ گرد زور سے ہنستے ہیں...... اور ہنستے ہوئے ان کے کندھے اور پیٹ آگے پیچھے جھولنے لگتے ہیں۔ اس ہلچل میں مائکرو میگاس کے ناخن سے جہاز لڑکھڑا کر گرتا ہے اور زحل کے باشندے کے جانگھیے کی جیب میں جا گرتا ہے۔ وہ جہاز کو جیب سے نکالتا ہے اور دوبارہ سمندر میں رکھ دیتا ہے۔ پھر دونوں اپنے گھروں کو لوٹ جاتے ہیں۔ کرۂ ارض کی سیاحت سے وہ یہ نتیجہ اخذ کرتے ہیں کہ ''ایک پاگل خانہ ہے جہاں برخود غلط مخلوق آباد ہے۔''

''گلیور ٹریولز'' کے طرز پر لکھی جانے والی والتیئر کی یہ کتاب اس کے قیام انگلستان کی یاد دلاتی ہے۔ ایسی ہی ایک اور کتاب ''انگریزوں کے بارے میں خطوط'' ہے۔ والتیئر نے

اس کتاب کو ''فلسفیانہ خطوط'' کا عنوان بھی دیا تھا- اس سے صاف طور پر یہ ظاہر تھا ہوتا ہے وہ انگریزوں کو فلسفیوں کی قوم سمجھتا تھا- فلسفیوں سے اس کی مراد آزادی کو پسند کرنے اور اپنی عقل ودانش سے کام لینے والے افراد ہیں-

یہ کتاب اسلوب کے اعتبار سے والتیئر کی اکثر تصانیف سے مختلف ہے- اور طنزیہ تحریروں کے اسلوب میں اس کی نئی دلچسپی کو ظاہر کرتی ہے- ہم اس کو نثر میں لکھی جانے والی اس کی پہلی اہم تحریر قرار دے سکتے ہیں- اس حوالے سے اس کے وکٹوریائی عہد کے ایک نقاد جان مورلے کا یہ تبصرہ بالکل مناسب ہے کہ والتیئر جب فرانس سے چلا تھا تو وہ ایک شاعر تھا- مگر جب واپس فرانس پہنچا تو مدبر بن چکا تھا-

''انگریزوں کے بارے میں خطوط'' یا دوسرے لفظوں میں یوں کہے کہ ''فلسفیانہ خطوط'' 1734 میں شائع ہوئی تھی- ہم اس کتاب کے بارے میں مزید چند باتیں اگلے باب میں کریں گے- یہاں ہم والتیئر کے قیام انگلستان کے بارے میں یہ کہنا چاہتے ہیں کہ وہاں اس نے انگریزی ادب کے علاوہ فلسفی لاک اور سائنس دان نیوٹن کے متعلق بھی بہت کچھ سیکھا تھا- اس کے عملی فلسفہ کی تشکیل میں ان دونوں نے بہت سا حصہ لیا ہے- علاوہ ازیں اٹھارہویں صدی کے انگریز موحدوں نے فطری مذہب میں اس کی دلچسپی بڑھا دی اور اس کو بہت سے دلائل اور خیالات بھی دیے- یوں اس کے خیالات میں وضاحت اور نکھار پیدا ہوا-

لندن میں والتیئر کے قیام کے بارے میں زیادہ تفصیلات معلوم نہیں ہیں-لگتا ہے کہ انگریزوں نے اس فرانسیسی نابغہ پر زیادہ توجہ نہ دی تھی-

''فقیر کا اوپیرا'' نامی کھیل کے مصنف، جان گے، نے البتہ 22 نومبر1726 کے ایک خط میں اس کی آمد کا ذکر کیا تھا- اس نے لکھا تھا کہ ''فرانس کا ایک مشہور ادیب ان دنوں لندن آیا ہوا ہے- اس کو شولر ڈی روہان کے ساتھ ایک جھگڑے کے بعد اپنے ملک سے نکلنا پڑا تھا- وہ لگ بھگ نصف سال سے یہاں ہے اور اچھی طرح انگریزی زبان بولنے لگا ہے-''

وہ حالات واضح طور پر معلوم نہیں ہیں جن میں والٹیر نے انگلستان سے واپس وطن جانے کا ارادہ کیا تھا- تاہم بعض سوانح نگاروں نے اس کے خطوط کی بنیاد پر دعوی کیا ہے کہ

وہ ناخوش ہوکر واپس گیا تھا- اس امر کے اشارے بھی ملتے ہیں کہ اس کی بعض حرکات کو پسند نہ کیا گیا تھا اور والتیئر ایسی حرکات کے بغیر رہ نہ سکتا تھا- بہرحال واپسی کے کئی سال بعد اس نے لکھا تھا کہ ''میں اپنی زندگی میں انگریزوں جیسی کوئی شے ہمیشہ برقرار رکھوں گا-''

5

انگریزوں کے بارے میں خطوط

آزادی کی سرزمین پر جلاوطنی کے تین سال گزارنے کے بعد والٹیئر واپس پہنچا تو فرد کی آزادی، سیاسی حقوق، منصفانہ معیشت اور ذمہ دارانہ سیاسی نظام کے بارے میں اس کے خیالات زیادہ واضح ہو چکے تھے- مذہبی تنگ نظری، تعصب، جبر اور نظریاتی گھٹن سے اس کی نفرت پہلے سے بڑھ چکی تھی- مگر اس کے اپنے وطن میں ان تین برسوں کے دوران کچھ بھی نہ بدلا تھا- حالات جوں کے توں تھے- شاید خرابی بڑھ گئی تھی-

والٹیئر کی واپسی کے دنوں میں ایمبر ون کے مقام پر بشپ صاحبان کا ایک اہم اجلاس منعقد ہوا تھا- اجلاس میں ہونے والے فیصلے اس زمانے کے فرانس کی تہذیبی صورت حال کی بہت اچھی طرح عکاسی کرتے ہیں- چنانچہ ہم دیکھتے ہیں کہ مذہب کے ان معزز اور ذمہ دار صاحبان نے اپنے اجلاس میں بیس ہزار سے زیادہ شہریوں کو کسی قسم کے مقدمے کے بغیر گرفتار کرنے کے احکام جاری کیئے، ملکی قانون ان کے ساتھ تھا اور ان کو اس قدر وسیع پیمانے پر گرفتاریوں کا اختیار دیتا تھا- حقیقت تو یہ ہے کہ وہ کسی بھی شخص کو مذہبی امور پر اختلاف کے باعث آزادی سے محروم کر سکتے تھے اور اس کو ظالمانہ تشدد کا نشانہ بھی بنا سکتے تھے-

ادیبوں اور دانش وروں کو کفر کے فتوی جاری کرنے اور لوگوں کو جیلوں میں بند کرنے کا اختیار حاصل نہ تھا- مگر کیا ہوا- وہ آپس میں ایک دوسرے کو نشانہ ستم تو بنا سکتے تھے- چنانچہ حالات اور نظام کی اصلاح پر توجہ دینے اور تہذیب وتمدن کی ترقی میں حصہ لینے کے بجائے وہ ایک دوسرے کو طعن وطنز کا نشانہ بنا رہے تھے-

پیرس پہنچنے پر والتیئر چند روز چھپا رہا- آخر کار اس نے اپنی ایک مختصر تحریر کے ذریعے اپنی آمد کا اعلان کر دیا- یہ تحریر پادریوں پر حملہ تھی- مصنف نے اپنی مخصوص چالاکی سے کام لیا تھا- وہ بظاہر قرون وسطیٰ کے ان فضول جھگڑوں اور بحثوں کا ذکر کرتا ہے جن میں ارباب مذہب مصروف رہا کرتے تھے- لیکن اس کا حقیقی نشانہ اس کے اپنے زمانے کے پادری اور دوسرے لوگ تھے جو ایک دوسرے سے الجھ رہے تھے- والتیئر نے اس تحریر میں اپنا خاص طنزیہ انداز استعمال کیا ہے- وہ لکھتا ہے کہ ایک بزرگ ڈاکٹر نے اس کو بتایا کہ جوانی کے دنوں میں اس نے پوپ کے خلاف قلم اٹھایا تھا- پھر اس کو جیل میں ڈال دیا گیا تھا- اور'' میں اپنے آپ کو شہید خیال کرنے لگا- اب میں نے وطیرہ بدل لیا ہے کسی معاملے میں دخل نہیں دیتا اور خود کو معقول آدمی سمجھتا ہوں-''

''بہت خوب'' والتیئر نے پوچھا-''مگر آپ خود کو مصروف کیسے رکھتے ہیں-''

''جناب میں دولت سے پیار کرتا ہوں'' بزرگ ڈاکٹر نے جواب دیا-

''اچھا تو یہ ہے بات- لوگ بڑھاپے میں جوانی کی حماقتوں پر ہنستے ہیں- کام بھی لوگوں کی طرح بوسیدہ ہو جاتے ہیں-''

انہی دنوں والتیئر نے ''بروٹس'' کے عنوان سے ایک سیاسی کھیل لکھا- چند اور ڈرامے بھی اسی زمانے کی یادگار ہیں- ''زائرے'' ان میں سے ایک ہے جو بہت کامیاب رہا تھا- اس میں والتیئر نے جرات اور حوصلہ مندی سے کام لیا ہے، مگر احتیاط کا دامن بھی نہیں چھوڑا- اس کھیل کا پلاٹ شیکسپیئر کے مشہور کھیل ''اوتھیلو'' سے لیا گیا ہے-

یہاں یہ امر قابل ذکر ہے کہ یہ والتیئر ہی تھا جس نے اہل فرانس کو اول اول شیکسپیئر سے متعارف کروایا تھا- لندن میں قیام کے دوران اس نے انگریزی زبان سیکھی تھی اور انگریزی ادبیات کا مطالعہ کیا تھا- وہ متاثر بھی ہوا تھا- لیکن عجیب بات ہے کہ شیکسپیئر اس کو بالکل اچھا نہ لگا تھا- بعد کے زمانے میں اس نے ''یورپ کی تمام اقوام سے اپیل'' کے

عنوان سے ایک پمفلٹ لکھا تھا جس میں شیکسپیئر پر کڑی نکتہ چینی کی تھی۔ اس پمفلٹ کی اشاعت کے دو سال بعد اس نے شیکسپیئر کے ڈرامہ ''جولیس سیزر'' کا فرانسیسی زبان میں لفظی ترجمہ کیا۔ اس ترجمے کا مقصد عظیم قرار پانے والے اس انگریز مصنف کی تحریر میں ''پائی جانے والی نظم وضبط کی کمی'' کو واضح کرنا تھا۔ ایبے ڈی اولی وٹ کے نام ایک خط میں بھی اس نے شیکسپیئر کی خامیاں اور کوتاہیاں گنوائی ہیں۔ سچی بات یہ ہے کہ وہ شیکسپیئر کو اجڈ خیال کرتا تھا۔ بہت سے انگریز اس بات پر ناراض ہوئے ہیں۔ یہاں تک کہ کارلائل نے والتیئر کو ''پاگل آدمی'' قرار دے دیا تھا۔

خیر جہاں تک انگریزی فلسفہ، سائنس، سماج اور سیاست کا تعلق ہے وہ ان کے گن گا رہا تھا اور برطانیہ کے مقابلے میں اپنے وطن کی حالت اس کو دکھ دے رہی تھی۔ وہ پیرس میں مقیم تھا کہ اس دارالحکومت میں ایک ایسا واقعہ پیش آیا جس نے اس کو ایک بار پھر برطانوی سماج کی برتری کا شدید احساس دلایا۔ لندن میں قیام کے دوران اس نے نیوٹن کی تجہیز وتکفین کا منظر دیکھا تھا۔ وہ یہ دیکھ کر حیران رہ گیا تھا کہ اس سائنس دان کی موت پر سارے برطانیہ میں سوگ منایا گیا تھا اور اس کو تمام ممکنہ اعزازات کے ساتھ نہایت عزت واحترام سے دفن کیا گیا تھا۔

اس کے اپنے معاشرے کی کیفیت ایڈرین لیکو ورور کی موت پر سامنے آ گئی۔ وہ والتیئر کے زمانے کی ایک بڑی اداکارہ تھی۔ والتیئر اس کے فن کا مداح تھا۔ عظمت اور مقبولیت کے دور میں ہی موت نے اس کو دبوچ لیا۔ فن کی قدر وقیمت اور عظمت سے بے خبر پادریوں نے اس کی آخری رسوم ادا کرنے سے انکار کر دیا اور قبرستان میں اس کے ''گندے'' جسم کے لئے جگہ نہ دی۔ یوں اس اداکارہ کو دریائے سین کے کنارے ایک ویران جگہ پر سپرد خاک کرنا پڑا۔

والتیئر ایڈرین لیکو ورور کے ماتمی جلوس کے پیچھے پیچھے چل رہا تھا غم وغصے سے اس کا خون کھول رہا تھا۔ خدا جانے وہ ضبط کرنا چاہتا تھا یا نہیں۔ لیکن جاہل پادریوں کے ہاتھوں ایک عظیم اداکارہ کی توہین پر وہ احتجاج کئے بغیر نہ رہ سکتا تھا۔ آخر کار اس کے جذبات ایک جوشیلی نظم کی صورت میں ڈھل گئے۔ وہ بار بار خود سے پوچھتا تھا کہ کیا خدا کے نمائندے ہمیشہ ہر اس شے کی توہین کرتے رہیں گے جو خوبصورت ہے، نفیس ہے، اعلیٰ ہے اور اس کو

پسند ہے؟ کیا قانون اور اخلاق میں ہمیشہ تصادم رہے گا؟ فرانس کے لوگ کب تک اوہام پرستی میں مبتلا رہیں گے؟ آخر ایسا کیوں ہے کہ برطانیہ میں کوئی فن کی توہین نہیں کرتا- ہر کوئی کمال کی داد دیتا ہے- کوئی کامیابی وہاں شہرت اور احترام سے محروم نہیں رہتی ایڈرین لیکو ورور پیرس کے بجائے لندن میں ہوتی تو اس کا آخری سفر کس قدر شاندار ہوتا- اس کی موت کا سوگ منایا جاتا- واقعی اس کو کس قدر عزت واحترام کے ساتھ سپرد خاک کیا جاتا-

اس بے چاری کا قصور بس یہ تھا کہ وہ ایک تنگ سے سمندر، درباد انگلستان، کے اس پار پیدا ہوئی تھی!

نظم شہر میں پھیل گئی- اداکارہ کے ہزاروں مداح تھے- دل ہی دل میں پادریوں کی حماقت پر کڑھنے والے بھی کم نہ تھے- مگر سٹیج پر سینکڑوں لوگوں کے رو برو ناچنے گانے اور تھرکنے والی ایک ''فاحشہ'' کے لئے اس قسم کے جذبوں کے اظہار کو پادریوں نے شرمناک کفر قرار دے ڈالا- جان بچانے کے لئے والتیئر کو ایک بار پھر بھاگنا پڑا- اس نے نار منڈی کے ایک گاؤں میں پناہ لی-

والتیئر اس گاؤں میں تھا تو پیرس میں خفیہ طور پر اس کی کتاب ''انگریزوں کے بارے میں خطوط'' شائع ہوگئی- (ایک اور ایڈیشن پر والتیئر نے ''فلسفیانہ خطوط'' کا عنوان دیا تھا) یہ ایک چھوٹی سی کتاب ہے- مگر اس نے بڑا طوفان اٹھایا- ہم شروع میں ہی یہ بتا دیں کہ یہ کوئی ظالمانہ کتاب نہیں جس میں انگریزی تہذیب وتمدن یا اس کی تاریخ کا کوئی تجزیاتی مطالعہ پیش کیا گیا ہو- والتیئر کو اس قسم کی کتابیں لکھنے سے کوئی دلچسپی نہ تھی- سچ تو یہ ہے کہ اس کو وہ عالمانہ کتابیں ایک آنکھ نہ بھاتی تھیں جو لکھی جاتی ہیں اور پھر کتب خانوں کی زینت بنا دی جاتی ہیں- وہ عالم فاضل کا کردار ادر کرنے کا کوئی ارادہ نہ رکھتا تھا- وہ تو اپنے ملک کے حالات، مذہبی جہالت، جبر، تعصب، بے انصافی اور غلامی کے خلاف عقل اور روشن خیالی کی جنگ لڑ رہا تھا- اس لئے وہ عالمانہ کتابیں نہیں لکھتا تھا- کتابوں کی صورت میں وہ دشمن کے مورچوں پر گولے پھینک رہا تھا-

دیگر تحریروں کی طرح والتیئر نے ''انگریزوں کے بارے میں خطوط'' بھی علمی مقاصد کے لئے لکھے- مقصد یہ تھا کہ اپنے ہم وطنوں کو انگریزوں کی مذہبی رواداری، عقل دوستی اور ان کے آزادی پسند سیاسی اور سماجی نظام کے بارے میں بتایا جائے تا کہ اوہ اپنے ملک اور

سماج کی خرابیوں پر غور کر سکیں اور اپنی اصلاح پر مائل ہوں۔

یہ کتاب ہلکے پھلکے انداز میں لکھی گئی ہے۔ جابجا طنز و مزاح سے کام لیا گیا ہے۔ مصنف برطانیہ میں پائی جانے والی مذہبی رواداری کا ذکر کرتا ہے اور کہتا ہے کہ وہاں ایک دو نہیں بلکہ تیس مذہبی فرقے ہیں۔مگر وہ سب مل جل کر رہتے ہیں۔ ایک دوسرے کے ساتھ اختلاف کو قبول کرتے ہیں اور ان کا احترام بھی کرتے ہیں۔

اس رواداری پر زور دینے کا اصل سبب یہ تھا کہ وہ اچھی طرح جانتا تھا کہ مذہبی عقاید کی کثرت اصل میں ان کی کمزوری کو ظاہر کرتی ہے۔ وہ اشارہ دیتا ہے کہ فرانس میں صرف ایک فرقے کو بالادستی حاصل ہے۔ برطانیہ میں بھی بس ایک ہی فرقہ ہوتا تو وہاں ذہنی اور روحانی آمریت قائم ہوجاتی۔ اگر دو فرقے ہوتے تو خانہ جنگی کے حالات موجود رہتے۔ چونکہ فرقوں کی تعداد زیادہ ہے لہٰذا وہ مل جل کر رہنے پر مجبور ہیں۔

مذہبی رسوم پرستی کا مذاق اڑانے کے لئے وہ اس زمانے کے ایک پرجوش مذہبی فرقہ، کوئیکرز، کے ایک فرد کے ساتھ اپنی بات چیت کا حوالہ دیتا ہے۔

''جناب'' وہ اپنے اس افسانوی کوئیکر سے پوچھتا ہے۔

''آپ نے بپتسمہ تو لے رکھا ہوگا۔''

''نہیں'' کوئیکر جواب دیتا ہے اور ساتھ ہی وضاحت کرتا ہے کہ ''میرے ساتھیوں نے بھی بپتسمہ نہیں لیا۔''

''ارے ارے'' وہ بات آگے بڑھاتا ہے۔''تو گویا آپ مسیحی نہیں ہیں۔''

''دوست ایسا مت کہیے۔ خدا کے فضل سے ہم مسیحی ہیں۔ لیکن ہمارا نہیں خیال کہ مسیحیت کا دارومدار کسی کے سر پر چٹکی بھر نمک والا پانی چھینکنے سے ہے۔''

'' خدا معاف کرے'' والتیئر ظاہر کرتا ہے کہ گویا یہ ''بے دینی'' اس کے لئے ناقابل برداشت ہے۔ وہ یاد دلاتا ہے کہ ''کیا آپ بھول گئے کہ جان نے حضرت عیسیٰ کو بپتسمہ دیا تھا؟''

''میرے دوست'' اب کوئیکر کی وضاحت پیش کرنے کی باری تھی۔'' آپ سچ کہتے ہیں جان نے مسیح کو بپتسمہ دیا اور ہم مسیح کے چیلے ہیں، جان کے نہیں۔''

''آہ، مقدس عدالت تمھیں ضرور طلب کرے گی۔''

لندن میں قیام کے دوران والٹیئر کا کئی انگریز موحدوں کے ساتھ میل ملاپ رہا تھا۔ لیکن اپنی اس تصنیف میں اس نے فطری مذہب کے ان دعویداروں کو قابل احترام بنا کر پیش کرنے کی جرات نہیں کی۔ وہ اشاروں کنایوں میں ان کا ذکر کرتا ہے اور یہ جتلانا چاہتا ہے کہ سماج کو ان لوگوں کے بجائے نفرت کے بیج بونے والے علمائے مذہب سے خطرہ حق ہوتا ہے۔

بعد کے زمانے کی بعض تحریروں کی طرح والٹیئر نے ان خطوط میں یہودیوں کو نکتہ چینی کا ہدف، بلکہ یوں کہیئے کہ، نشانہ ستم بنایا ہے۔ وہ یہودی تاریخ وروایت کی وحشتوں، بد اخلاقیوں اور ناانصافیوں کا خاص طور پر ذکر کرتا ہے۔ ہم اس رویے کی وجہ آسانی سے جان سکتے ہیں۔ بات یہ ہے کہ والٹیئر جب مسیحی روایت پر حملہ کرنے کا ارادہ کرتا تھا تو اس کا ہاتھ روکنے والے بہت سے تھے۔ وہ طاقتور بھی تھے اور والٹیئر کو پیچھے ہٹنے پر مجبور کر سکتے تھے۔ یہودیوں پر زبانی گولہ باری سے روکنے والا کوئی نہ تھا۔ لہٰذا وہ کھل کر بات کرسکتا تھا۔ ایک اور وجہ بھی ہے اور وہ یہ ہے کہ بعض دوسرے موحدوں کی طرح والٹیئر بھی اس نکتے سے باخبر تھا کہ یہودیوں کو قابل نفرت، وحشی اور توہم پرست بنا کر پیش کرنے سے مسیحیت بھی نشانہ بن جاتی ہے۔ گویا یہودیت کی آڑ میں وہ اپنے مذہب یعنی مسیحیت پر وار کررہا تھا۔ عام لوگ اس کاٹ کو محسوس کر سکتے تھے۔

اس طریقہ واردات کو وسعت دیتے ہوئے وہ عبرانی تہذیب کے مقابلے میں دور دراز کی چینی تہذیب کے گن گاتا تھا۔ اس کو زیادہ قابل احترام اور زیادہ قدیم قرار دیتا تھا۔ یوں یہودیت کے پردے میں اس کی نکتہ چینی مسیحیت تک جاپہنچتی تھی۔ وہ ایسی باتیں کہنے اور ایسے اعتراضات اٹھانے کے قابل ہوجاتا تھا جو براہ راست انداز میں نہ اٹھائے جاسکتے تھے۔ اس نے یہ طریقہ کار ''انگریزوں کے بارے میں خطوط'' کے علاوہ بعض دوسری تحریروں، خصوصاً تاریخی موضوعات پر اپنی کتابوں میں بھی استعمال کیا ہے۔

اچھا تو کیا ہم والٹیئر کو یہود دشمن قرار دے سکتے ہیں؟

سرسری طور پر دیکھا جائے تو اس سوال کا جواب ''ہاں'' میں ہے۔ اس ''ہاں'' کی تائید میں اس کی تحریروں سے کئی اقتباس پیش کئے جاسکتے ہیں۔ لیکن والٹیئر کی پوری شخصیت، اس کے مقاصد اور طریقہ کار کو پیش نظر رکھا جائے تو پھر ہم اس کو اعتماد کے ساتھ یہود دشمن قرار

دینے میں بلا شبہ ہچکچاہٹ محسوس کریں گے- تب ہم کو یہ کہنا ہوگا کہ وہ اس حد تک یہود مخالف ہے جس حد تک وہ مذہب کا مخالف ہے- بے شک وہ دل ہی دل میں یہ نہیں مانتا تھا کہ تمام یہودی مسیحیوں سے کمتر ہیں یا تمام چینی اعلیٰ تر ہیں- یہودیوں اور ان کی مقدس کتاب تورات پر اس کی نکتہ چینی ، حرف گیری اور تضحیک اصل میں ادارہ جاتی مذہب کے خلاف اس کی مہم کا حصہ تھی- اس کو بخوبی علم تھا کہ یہودیت کے بغیر مسیحیت ادھوری ہے اور یہ کہ مسیحیت کو یہودیت سے الگ نہیں کیا جاسکتا- ایک بار اس نے خود اعتراف کیا تھا کہ " جب میں مسیحیوں کو یہودیوں پر لعن طعن کرتے دیکھتا ہوں تو مجھے لگتا ہے کہ جیسے بچے اپنے باپ کو پیٹ رہے ہوں-"

ہماری اس بحث سے یہ نہ سمجھے گا کہ "انگریزوں کے بارے میں خطوط" میں صرف مذہبی معاملات ہی زیر بحث آئے ہیں- مصنف نے برطانوی سیاسی نظام پر بھی خاطر خواہ توجہ دی ہے جو بلا شبہ اس زمانے کے فرانسیسی نظام سے کہیں زیادہ ترقی یافتہ تھا- اس میں ایسی بہت سی خوبیاں موجود تھیں جن کا والتیئر دلدادہ تھا- مگر ہم کو اس کی حدود اور اس کے حالات کے تقاضوں کا خیال رکھنا چاہیئے اور یہ جان لینا چاہیئے کہ وہ کھل کر انگریزوں کے نظام کی برتری اور خود اپنے ملک کے نظام کی خرابیوں کا چرچا نہ کرسکتا تھا- کئی جگہ اس نے اپنی بات کہنے کے لئے طنز ومزاح سے کام لیا ہے- وہ جتلاتا ہے کہ برطانیہ میں قانون کی حکومت ہے اور قانون کی نظروں میں تمام شہری یکساں مقام رکھتے ہیں- کسی شہری کو قانونی تقاضے پورے کئے بغیر آزادی سے محروم نہیں کیا جاسکتا- وہاں امرا اور بادشاہ دونوں موجود ہیں- لیکن پارلیمنٹ میں، یعنی قانون سازی کے عمل میں، عوام کے نمائندوں پر مشتمل دارالعوام کو زیادہ اثر ورسوخ حاصل ہے- بادشاہ کا حال یہ ہے کہ وہ قانون کا پابند ہے اور مطلق العنان نہیں ہے- قوانین بادشاہ کے نام پر بنتے ہیں لیکن بنانے والے پارلیمنٹ کے ارکان ہوتے ہیں-

فرانس میں اشرافیہ پر بہت کم ٹیکس ہے- ٹیکسوں کا سارا بوجھ عوام پر ہے- اس کے برعکس برطانیہ میں تمام شہری ٹیکس ادا کرتے ہیں- اور ٹیکس کا نفاذ سماجی رتبے کے اعتبار سے نہیں بلکہ آمدنی کی شرح پر ہوتا ہے- اس نظام نے لوگوں کو اظہار کی آزادی مہیا کی ہے- اور لوگ اجتماعی معاملات پر کسی خوف کے بغیر رائے دیتے ہیں- یہاں تک کہ وہ کھلے بندوں

حکومت پر بھی تنقید کر سکتے ہیں۔

والتیئر نے برطانوی نظام کی بہت سی خوبیوں کو اجاگر کرتے ہوئے انگریز کسانوں کی بہتر صورت حال کا ذکر بھی کیا ہے۔ اس کے اپنے ملک میں کسان سب سے زیادہ مظلوم طبقہ تھے۔ ان کی حالت غلاموں سے کچھ ہی بہتر تھی۔ ان کی حالت زار کا براہ راست ذکر کئے بغیر والتیئر برطانوی کسانوں کا اس انداز سے تذکرہ کرتا ہے کہ اس کے معاصرین دونوں ملکوں کے کسانوں کے حالات کا موازنہ کئے بغیر نہ رہ سکتے تھے۔ چنانچہ وہ لکھتا ہے کہ ''انگریز کسانوں کے پاؤں کھڑاؤں سے زخمی نہیں ہوتے۔ وہ آرام دہ جوتے پہنتے ہیں۔ وہ سفید روٹی کھاتے ہیں۔ اچھا لباس پہنتے ہیں۔ اپنی چھتوں کو ٹائیلوں سے ڈھکنے سے نہیں ہچکچاتے۔ ان کو یہ خوف لاحق نہیں رہتا کہ آئندہ سال ان پر ٹیکس پہلے سے بھی بڑھا دیا جائے گا۔ وہ اپنی زمین پر ہل چلانے کو باعث ذلت نہیں سمجھتے۔ اس کام نے ان کو خوش حالی عطا کی ہے۔ وہ اپنی زمین پر آزاد انسانوں کی طرح (عزت واحترام کے ساتھ) رہتے ہیں۔''

6

گڈرنی

والتیئر احتیاط سے کم لینا جانتا تھا- ''انگریزوں کے بارے میں خطوط'' کی اشاعت کے معاملے میں اس نے زیادہ ہی احتیاط برتی تھی- اس کو پتہ تھا کہ فرانس کے سیاسی اور مذہبی حکمران اس کتاب کو برداشت نہ کر پائیں گے اور طوفان اٹھائیں گے- چنانچہ احتیاطی قدم کے طور پر اس نے یہ کتاب پہلے 1733ء میں لندن سے شائع کروائی- اگلے سال اس کو خفیہ طور پر فرانس میں چھاپا گیا اور پیرس میں تقسیم کیا گیا- ایک روایت یہ ہے کہ والتیئر اس کتاب کی عام اشاعت نہ چاہتا تھا- وہ صرف دوستوں میں تقسیم کرنا چاہتا تھا- مگر ہوا یہ کہ ایک ناشر کے ہاتھ اس کا نسخہ لگ گیا اور اس نے مصنف کی اجازت کے بغیر یہ کتاب چھاپ دی-

جونہی یہ کتاب منظر عام پر آئی احتسابی ادارے بھی حرکت میں آ گئے- ناشر فوراً قابو میں آ گیا اور اس کو جیل میں بند کر دیا گیا- حاکموں نے اس کتاب کو ''مذہب، اخلاق اور امن عامہ کے لئے سنگین خطرہ'' قرار دیا- اس کو سر عام پھاڑنے اور جلانے کا حکم دیا گیا-

10 جون 1734 کو یہ کتاب پیرس میں سر عام نذر آتش کر دی گئی-

جو خدشے والتیئر کے دل میں تھے، وہ درست ثابت ہوئے- مگر وہ تیسری بار جیل جانے پر تیار نہ تھا- جان بچانے کے لئے اندھا دھند بھاگا تو سیدھا اس محبوبہ کی بانہوں میں

جاگرا جس سے انہی دنوں آشنائی ہوئی تھی اور جس کے دامن میں اس کی زندگی کے آنے والے چودہ سال بسر ہونے والے تھے۔

یہ ایک عجیب وغریب عورت تھی۔ اس کا نام گیبریل ایمیلی دو شاتیلیت تھا۔ وہ اس زمانے کی پیرس کی سماجی تتلیوں میں سے ایک تھی، مگر دوسروں سے بالکل مختلف تھی۔ جب والتیئر کی اس سے ملاقات ہوئی تو وہ 27 سال کی تھی اور والتیئر 39 ویں برس میں قدم رکھ چکا تھا۔ مگر غیر شادی شدہ تھا۔ باقاعدہ شادی اس نے کبھی نہ کی۔ ایمیلی شادی شدہ اور تین بچوں کی ماں تھی۔ مگر اس نے جی میں ٹھان رکھی تھی کہ تین بچوں کو جنم دے کر وہ شوہر اور ازدواجی زندگی کی ذمہ داریوں سے آزاد ہوگئی ہے۔ والتیئر سے پہلے، پیرس میں، اس کے کم ازکم تین معاشقوں کا چرچا ہوچکا تھا۔ ان میں سے ایک کے خاتمے پر وہ اس قدر دل برداشتہ ہوئی کہ اس نے اپنی جان لینا چاہی۔ یہ واقعہ ہم کو اس کی جذباتی شخصیت کی خبر دیتا ہے۔

خیر، ہم کو جان لینا چاہیئے کہ مادام ایمیلی کی شہرت کا باعث محض اس کے معاشقے نہ تھے۔ یہ ہی حسن وخوبصورتی اس کی وجہ شہرت تھی۔ سچی بات تو یہ ہے کہ مادام کے دوستوں اور شناساؤں میں سے کئی ایک نے اس کے رنگ روپ کا ذکر کیا ہے۔ ان میں سے بعض کا کہنا یہ ہے کہ وہ لمبی چوڑی اور بدوضع عورت تھی۔ ہم تک ایک رپورٹ مادام دو دیفان کی پہنچی ہے۔ وہ نابینا تھی مگر اپنے زمانے کی تعلیم یافتہ خواتین میں شمار ہوتی تھی۔ اس نے اپنا سیلون قائم کر رکھا تھا۔ والتیئر سے اس کی پرانی دوستی تھی۔ اس خاتون کی گواہی یہ ہے کہ ایمیلی لمبی، بے رس، تنگ کولھوں اور چھوٹی چھاتیوں والی بے ڈھنگی عورت تھی۔

یہ عورت کے بارے میں دوسری عورت کی گواہی ہے۔ خواتین کی تحریک سے تعلق رکھنے والے چاہے جو بھی کہیں مگر کسی عورت کے حسن ورعنائی کے بارے میں دوسری عورت کی گواہی کو عقل مندی کے تقاضے نظر انداز کئے بغیر قبول نہیں کیا جاسکتا۔ خیر، بعض دوسری شہادتیں یہ ہیں کہ ایمیلی اپنے زمانے کی خوبصورت عورتوں میں سے ایک تھی۔ اس میں جنسی کشش بے پناہ تھی۔

وہ جسمانی حسن کا نمونہ نہ ہوتو بھی اس کے ذہنی حسن پر شبہ محال ہے۔ اٹھارہویں صدی کے فرانس کے اعلیٰ طبقہ کی بہت سی خواتین کی طرح وہ اعلیٰ تعلیم یافتہ تھی۔ فرانسیسی کے علاوہ

لاطینی زبان جانتی تھی- سائنسی علوم سے اس کو گہرا شغف تھا- ریاضی پر اس کو عبور حاصل تھا- یہاں تک کہ اس نے نیوٹن کی شہرہ آفاق کتاب ''اصول ریاضی'' کا فرانسیسی زبان میں ترجمہ کیا تھا اور اس کی شرح بھی لکھی تھی- علاوہ ازیں تاریخ اور لسانیات کے مطالعے میں بھی اس کو دلچسپی تھی- والتیئر اس کو فلسفی اور گڈرنی کہا کرتا تھا-

ایمیلی کا نام ابھی تک زندہ ہے تو اس کی بنیادی وجہ یہ ہے کہ برسوں تک والتیئر کی محبوبہ رہی تھی- مگر اس کی زندگی کا بڑا حصہ مطالعہ سائنسی تجربوں اور تصنیف وتالیف کے کام میں بسر ہوا تھا- اس کے ادبی کام اور جمالیاتی ذوق کی بارے میں زیادہ معلومات دستیاب نہیں ہیں- لیکن طبیعیات، مابعد الطبیعیات کے شعبوں میں اس کے مقالات اور کتابیں آج بھی تاریخی دلچسپی کا باعث ہیں مانا کہ اس کے کام کی حیثیت اورجنل یا عالمانہ نہ تھی، اس میں غلطیاں تھیں اور خامیاں بھی، البتہ اس سے یہ اندازہ ضرور ہوجاتا ہے کہ اس کا ذہن فطری سائنس کے بنیادی اصولوں اور طریقہ کار کو اچھی طرح سمجھتا تھا- وہ ذہانت اور تنقیدی اہلیت کے ساتھ تجریدی مسائل پر بحث کرسکتی تھی- اس نے کئی معاصر علما وفضلا کو ایسے خطوط لکھے جن میں ریاضی، طبیعیات اور مابعد الطبیعیات پر بحث ملتی ہیں- ان بحثوں کے معیار کا اندازہ ہم اس امر سے لگا سکتے ہیں کہ دیدرو جیسے عالم کو جب مادام ایمیلی نے اسکی کتاب کے بارے میں ایک خط لکھا تو وہ بہت متاثر ہوا- اس نے یہاں تک کہا تھا کہ اس کی زندگی میں جو دو سب سے زیادہ خوش گوار لمحات آئے تھے، ان میں سے ایک مادام کے خط کے مطالعے کا لمحہ تھا-

مادام کے مشغلے بس دو تھے پڑھنا لکھنا اور محبتیں کرنا- جب والتیئر سے اس کی ملاقات ہوئی تو وہ محبت کی متلاشی تھی جو اس کو اپنے شوہر سے نہ ملتی تھی- اشرافیہ سے تعلق رکھنے والے اس کے شوہر کے مالی حالات زیادہ اچھے نہ تھے- وہ عموماً گھر سے دور اپنی فوجی مہموں میں مصروف رہتا یا پھر شکار سے دل بہلاتا تھا- درگزر سے کام لینے والے اس شوہر نے بیوی کے معاشقوں کو ذہنی طور پر قبول کر رکھا تھا-

واقعی بعض محبتوں میں کیا کچھ برداشت کرنا پڑتا ہے- بہرطور یہ وہ دن تھے کہ جب مادام کو ایک چاہنے والا چاہیئے تھا اور والتیئر کو پناہ گاہ کی ضرورت تھی جہاں وہ اپنے دشمنوں سے محفوظ رہ سکے- ''انگریزوں کے بارے میں خطوط'' کی اشاعت کے بعد بادشاہ نے اس

کی گرفتاری کا فرمان جاری کردیا تھا اور پادری اس کے خون کے پیاسے تھے۔ دشمنوں میں پیرس کا آرچ بشپ پیش پیش تھا جس کو ''عورتوں سے بے حد لگاؤ تھا اور فلسفی ایک آنکھ نہ بھاتے تھے۔'' ان حالات میں مادام نے والتیئر کو اپنی دیہی حویلی میں رہنے کی پیش کش کی۔ یہ ایک قدیم حویلی تھی جو پیرس سے دور بلجیم کی سرحد کے قریب سائرے کے مقام پر واقع تھی۔ والتیئر اس عالم فاضل اور شہوت انگیز عورت کی پیش کش مسترد نہ کرسکتا تھا۔

وہ سائرے روانہ ہوگیا جہاں اس کو دشمنوں سے پناہ کے علاوہ خوبصورت جسمانی اور ذہنی رفاقت میسر آسکتی تھی۔1734 کے سال کا خاصا حصہ اس نے حویلی کی مرمت اور تزئین و آرائش کے کام کی نگرانی میں گزارا۔ چند ماہ بعد مادام ایمیلی بھی آ گئی۔ دونوں مل کر رہنے لگے۔ ان کی رفاقت برسوں تک رہی اور آخر کار1749 میں مادام کی موت پر ختم ہوئی جو بلاشبہ والتیئر کی زندگی کا سب سے بڑا سانحہ تھا۔

والتیئر نے مادام کے بارے میں کئی نظمیں لکھیں۔ اس کے لئے کئی ڈرامے سٹیج کیے۔ کئی قصے کہانیاں تیار کیں اور بیش بہا علمی کام بھی کیا۔ ایک بار اس نے کہا تھا کہ مادام صرف اس وقت خوش ہوتی ہے جب اس کو کوئی علمی مسئلہ درپیش ہو یا پھر کسی عاشق کا سامنا ہو۔ اس نے یہ بھی لکھا تھا کہ مادام کی ذہنی صلاحیتیں نیوٹن سے کم نہ تھیں۔ پھر بھی وہ عشوہ گری اور تاش کھیلنے میں پوری زندگی بسر کرنے پر آمادہ رہتی تھی۔ لیکن جب اس سے پیار کی باتیں کی جاتیں تو وہ مابعد الطبیعیات پر بحث کرنا ضروری سمجھتی تھی۔

ان ایام کے قریبی دوستوں کے نام خطوط میں والتیئر نے اس نواب بیگم کو اپنی ''بیوی'' بیان کیا ہے اور یہ اشارہ بھی دیا ہے کہ یہ ''بیوی'' غالباً اس کو بھاڑو بنا رہی ہے۔ اس شبہ کے باوجود وہ ایمیلی کے سحر میں پوری طرح گرفتار تھا۔ اور سائرے سے باہر قدم نکالنا اس کے لئے بہت دشوار تھا۔ مدتوں وہ دونوں اکٹھے رہے۔ رفاقت کے اس سفر میں اتار چڑھاؤ آتے رہے۔ دونوں کا مزاج آتشی تھا۔ وہ لڑتے جھگڑتے تھے۔ پھر گھل مل جاتے تھے۔

حویلی کی تجربہ گاہ میں دونوں سائنسی تجربے کرنے، لکھنے اور پڑھنے میں مصروف رہتے۔ کئی عالم اور ممتاز شخصیات ان سے ملنے کے لئے وہاں آتی رہیں۔ کبھی کبھی خود نواب صاحب یعنی ڈوشاتیلیت بھی آ نکلتے۔ مگر انہوں نے اپنی شریک حیات کا نظام زندگی قبول کر رکھا تھا۔ اور اس پر ان کو کوئی اعتراض نہ تھا۔ لہٰذا چند روز رہنے کے بعد وہ دوبارہ اپنی

مہمات کو نکل پڑتے۔

سائرے کی رنگین شاموں پر اب بھی لوگ رشک کرتے ہیں۔ شام کی محفلوں میں والتیئر اور ایمیلی کے مہمان کے علاوہ اور لوگ بھی شریک ہوتے۔ والتیئر نے ان محفلوں کے لئے خاص طور پر درجنوں قصے کہانیاں، ڈرامے، لطیفے اور چٹکلے لکھے تھے۔ وہ اپنی تیز وطرار اداکاری کے ساتھ پڑھ کر سناتا۔ سننے اور دیکھنے والے مبہوت رہ جاتے۔ ان محفلوں میں رقص وسرود کا اہتمام بھی ہوتا۔ مہمانوں کی تواضع بہترین شرابوں سے کی جاتی اور سو طرح سے ان کی خوشی کا سامان مہیا کیا جاتا تھا۔

بعض مہمانوں نے سائرے کی شاموں اور ان محفلوں کا ذکر کیا ہے۔ اس شاندار حویلی میں عیش وعشرت کے سامان وافر تھے اور ذہنی جستجو کے مواقع بھی کم نہ تھے۔ زندگی ویسی ہی پرلطف اور شاندار تھی جیسی کہ والتیئر چاہتا تھا۔ چنانچہ وہ بہت خوش تھا اور رہبانیت کا درس دینے والوں کی حماقت پر افسوس کرتا تھا۔ مسرت اور سرمستی کے ایک لمحے میں اس نے اعتراف کیا تھا کہ ''مجھے عیش وعشرت پسند ہے اور میں ارضی جنت میں آ گیا ہوں۔''

7

تاریخ نگار

وہ ارضی جنت میں رہتا تھا لیکن اپنے مقاصد نہ بھولا تھا- رنگ رلیاں اس کو اپنے کام سے دور نہ لے گئی تھیں- ویسے بھی وہاں مادم ایمیلی حوصلہ دلانے والی ایک روشن مثال کے طور پر موجود تھی- وہ اپنے طرز عمل سے یہ پیغام دیتی تھی کہ سچائی کی تلاش دنیاوی عیش وعشرت سے اعلیٰ وارفع ہے- اس حیرت انگیز خاتون نے زندگی کی مسرتوں سے رغبت اور سامان عیش کی فراوانی کے باوجود علوم وفنون کے مطالعے اور غور وفکر کو کبھی نظر انداز نہ کیا تھا- والتیئر اس کا موازنہ خود صداقت سے کیا کرتا تھا-

اس خاتون کے ساتھ سائرے میں برسوں کا قیام والتیئر کے لئے بے سود ثابت نہ ہوا اور وہاں اس نے بہت سا کام کیا- ڈرامے اور شاعری کے بعد اس کو سب سے زیادہ دلچسپی تاریخ سے تھی اور یہ دلچسپی عمر بھر قائم رہی- اس نے نہ صرف تاریخی موضوعات پر کتابیں لکھیں بلکہ اپنی شاعری اور ڈراموں کے بہت سے موضوعات بھی تاریخ سے حاصل کئے- سائرے میں قیام کے دوران اس نے تاریخ کا خاص طور پر مطالعہ کیا اور اس موضوع پر دو ایسی کتابیں لکھیں جن کا چرچا اب تک ہوتا ہے- ان میں سے ایک کا عنوان ''لوئی چہار دہم کی صدی'' اور دوسری کا عنوان ''رسوم پر ایک مقالہ'' ہے جو اصل میں تہذیب کی تاریخ ہے- تاریخی موضوعات پر اس کی اور بھی کئی کتابیں ہیں- علم تاریخ پر اس کے کام کی اہمیت کے

پیش نظر یکم اپریل1745 کو والتیئر کو فرانس کا شاہی مورخ مقرر کیا گیا- یہ وہ دن تھے کہ جب دربار کے ساتھ اس کا تعلق قائم ہوگیا تھا اور اشرافیہ کے کم ازکم ایک حصے نے اس کو قبول کر لیا تھا-

شاہی مورخ کا عہدہ حاصل ہونے کے بعد اس نے اپنے زمانے کی جنگوں فرانس کے پندرہویں لوئی بادشاہ اور روس کے پیٹر اعظم پر کتابیں لکھنے کا منصوبہ بنایا- پیٹر اعظم کے موضوع پر قلم اٹھانے کے لئے اس نے سینٹ پیٹرس برگ میں فرانسیسی سفیر کو لکھا کہ وہ پیٹر کی بیٹی ملکہ ایلزبتھ سے رابطہ کر کے معلوم کرے کہ آیا وہ اپنے باپ کے بارے میں مواد مہیا کرنا پسند کرے گی- ملکہ غالباً یہ درخواست قبول کرنے پر آمادہ تھی- لیکن روسی چانسلر نے اس منصوبے کو رد کر دیا- اس کا موقف یہ تھا کہ اس قسم کی تاریخ کسی غیر ملکی کے بجائے سینٹ پیٹرس برگ کی اکادمی کو لکھوانی چاہیئے-

یہاں یہ امر قابل ذکر ہے کہ سترہویں صدی کے یورپ میں اگرچہ یہ احساس نمایاں ہونے لگا تھا کہ تاریخ محض واقعات کو سن وار اکٹھا کر دینے کا نام نہیں ہے- لیکن اس زمانے کی تاریخ نگاری پر ارباب مذہب کو کم وبیش اجارہ داری حاصل تھی اور ان کا معاملہ یہ تھا کہ وہ تاریخی عمل کو خدائی کھیل کی تکمیل کا وسیلہ جانتے تھے- یہ ایک ایسا کھیل تھا جس کا آغاز ان کو معلوم تھا اور جس کے انجام سے بھی وہ بے خبر نہ تھے- اس رویے کے تحت لکھی جانے والی تاریخ بالآخر الٰہیات کی یک ذیلی شاخ بن کر رہ جاتی ہے-

علم تاریخ میں والتیئر کی کامیابیاں یہ نہیں ہیں کہ اس نے کئی تاریخی موضوعات اور ممتاز افراد پر کتابیں لکھی ہیں- (ویسے بھی یہ روایتی قسم کی کتابیں ہیں) بلکہ اس کی اصل کامیابی یہ ہے کہ اس نے تاریخ کے مذہبی تصور کے خلاف آواز بلند کی اور اس کو ختم کرنے کا ارادہ کیا- آج ہم جانتے ہیں کہ وہ اپنے اس مقصد میں کامیاب رہا تھا- ایک جدید مصنف نے والتیئر کو بجا طور پر ''جدید دنیا کا پہلا بھانڈا پھوڑ'' قرار دیتے ہوئے اس کے اس قول کا حوالہ دیا ہے کہ وہ تاریخ اس لئے لکھتا ہے کہ عظمتوں کے جو جھوٹے دعویدار تخت نشین ہیں، ان کو تخت سے گرائے اور ان کی جگہ تاریخ کی مسند پر ان لوگوں کو بٹھائے جو واقعی اس عزت واحترام کے حق دار ہیں-

بلا شبہ وہ دنیا بھر کے آمروں، سفاک حکمرانوں، فاتحوں، حملہ آوروں اور ظالموں سے

نفرت کرتا تھا- وہ ان مورخین کی حماقتوں کی مذمت کرتا تھا جو اس قسم کے افراد کو دوسرے لوگوں کے لئے مدح وستائش کا مستحق بنا کر پیش کرتے ہیں- اس کا کہنا تھا کہ جو لوگ وسیع پیمانے پر ظلم وستم کا باعث بنتے ہیں، ان کی پرستش کی جاتی ہے، ان کو عظمت عطا کی جاتی ہے اور پھر اس عظمت کے گن گائے جاتے ہیں- پروشیا کے ولی عہد کے نام ایک خط میں ایک بار اس نے لکھا تھا کہ تاریخ کی وہ تمام کتابیں سمندر میں غرق کردینی چاہئیں جو صرف بادشاہوں کے قہر وغضب اور ان کی خلاقی کمزوریوں کا مرقع ہیں- اس کا دعوی تھا کہ اس کا کام سچائی کو پیش کرنا ہے- مورخ خوشامدی نہیں ہوتا وہ سچائی کا متلاشی ہوتا ہے-

تاریخ کے نئے شعور کی طرف والتیئر کو متوجہ کرنے والے عوامل میں بولنگ بروک کی کتاب ''تاریخ کے مطالعہ پر مکتوب'' کو فراموش نہ کرنا چاہیئے- یہ کتاب تاریخ کے نئے طریقہ کار کی تشکیل کے حوالے سے اہم ہے- یہ یقین کرنے کا مناسب جواز موجود ہے کہ والتیئر نے اس کتاب کے اثرات قبول کئے تھے-

تاریخ کے بارے میں والتیئر کے خیالات جاننے کے لئے اس کی کتاب ''اخلاق پر ایک مقالہ'' سے رجوع کیا جاسکتا ہے- یہ مقالہ گبن کی مشہور کتاب ''سلطنت روم کا عروج وزوال'' سے نصف صدی پہلے لکھی گئی تھی اور اس میں پیش کئے گئے خیالات انقلاب آفرین ثابت ہوسکتے تھے- جی-پی-گوچ نے اپنی کتاب ''انیسویں صدی میں تاریخ اور تاریخ نگار'' میں لکھا ہے کہ کسی اور شخص سے زیادہ یہ والتیئر تھا جس نے ہم کو ماضی کے بارے میں نیا رویہ دیا- ظاہر ہے کہ اتھارٹی کے عاجز کردینے والے بوجھ کو صرف وہی شخص اتار کر پھینک سکتا تھا جو عقل کی قوت وعظمت کا مثالی علمبردار ہو-

اچھا اگر ہم کو معلوم ہو کہ والتیئر سے پہلے یورپ میں کس قسم کی تاریخ لکھی جاتی تھی تو پھر ہم کو یہ ماننے میں کم دشواری پیش آئے گی کہ اس نے تاریخ کے علم میں کسی نہ کسی حد تک قطعیت اور صراحت پیدا کرنے میں مدد دی ہے- یہ زمانہ تھا کہ جب ایک مشہور مورخ فادر دانیال نے لندن کی رائل لائبریری کی دستاویزات کی گیارہ بارہ موٹی موٹی جلدوں کا محض ایک گھنٹے تک جائزہ لینے کے بعد اپنی ''تحقیق'' سے مطمئن ہونے کا اعلان کردیا تھا- والتیئر کا رویہ زیادہ محتاط تھا- وہ تاریخی دستاویزات کو پڑھتا، اصلی کاغذات تلاش کرتا اور شہادتوں کی چھان بین کرتا- اس کے نزدیک تاریخ بادشاہوں کی زندگیوں اور معرکوں سے کہیں زیادہ

عام لوگوں کی زندگی میں رونما ہونے والی تبدیلیوں کے ساتھ ساتھ اخلاق، ادب اور علوم وفنون کے ارتقا کے محتاط مطالعے سے عبارت ہے۔

سائرے میں قیام کے دوران فرانس کے بارہویں چارلس بادشاہ کی جو تاریخ والتیئر نے لکھی، اس میں کم از کم دو ایسی خوبیاں موجود ہیں جو اس کو اٹھارہویں صدی میں لکھی جانے والی تواریخ کی کتب سے ممتاز کرتی ہیں۔ پہلی بات تو یہ ہے کہ مصنف کا رویہ اور نقطہ نظر غیر متعصّبانہ ہے۔ ہم اس کو معروضی اور سائنسی رویہ بھی کہہ سکتے ہیں۔ دوسری قابل ذکر خوبی وہ آزادی ہے جس کے ساتھ یہ کتاب لکھی گئی ہے۔ والتیئر کسی بھی موضوع پر ورثے میں چلے آنے والے خیالات کا احترام کرنے پر آمادہ نہ تھا۔ وہ ہر واقعہ کا خود تنقیدی جائزہ لیتا ہے۔ واقعات کو ''پرکھتا'' ہے اور جو بات اس کو ناقابل یقین محسوس ہوتی ہے، اس پر بے دردی سے تنقید کرتا ہے اور ردی کی ٹوکری میں پھینک دیتا ہے۔ اس معاملے میں وہ کسی مصالحت پر تیار نہیں ہوتا۔ وہ اس امر کو خاطر میں نہیں لاتا کہ بڑے بڑے نامور اور عالم فاضل لوگوں نے اس بات یا واقعہ کو قبول کیا ہے اور اسکی تائید کی ہے۔

ایک جگہ اس نے اپنے تصور تاریخ کی وضاحت کرتے ہوئے لکھا ہے کہ اس زمانہ میں مسیحی شہزادے ایک دوسرے کو فریب دیتے ہیں، آپس میں لڑتے جھگڑتے ہیں اور ایک دوسرے سے اتحاد بھی کرتے ہیں۔ یوں سینکڑوں معاہدے وجود میں آتے ہیں اور اتنی ہی لڑائیاں بھی ہوتی ہیں۔ ان شہزادوں کے اچھے برے اعمال کی تعداد بے شمار ہے۔ ان کے واقعات کا سارا پلندہ جب آئندہ نسلوں کو پہنچے گا تو وقت کا دھارا ان میں سے اکثر واقعات کو بہا کر لے جائے گا، صرف بادشاہ اور شہزادے بچیں گے جو بڑی بڑی تبدیلیوں کا باعث بنے تھے یا جن کو کسی بڑے مصنف نے محفوظ کر لیا تھا۔

والتیئر نے اپنی ایک اور کتاب ''تاریخ پر نیا غور وفکر'' میں بھی تاریخ کے منہاج پر بحث کی ہے۔1774 میں شائع ہونے والی اس کتاب میں اس نے روایتی انداز کی تاریخ نگاری پر یہ اعتراض کیا ہے کہ وہ بس جنگوں، جھگڑوں اور سیاست کی شعبہ بازیوں تک محدود رہتی ہے۔ اس نے زور دیا کہ تاریخ میں سماجی اور معاشی سوالات پر بھی غور وفکر ہونا چاہیئے۔ اس کا مطلب یہ ہوا کہ تاریخ کا مطالعہ اس کی سماجی اور فلسفیانہ قدر وقیمت کے حوالہ سے ہونا چاہیئے۔

وہ ان لوگوں میں سے تھا جنھوں نے روشن خیالی کے زمانہ میں تاریخ کے نئے تصور کو پہلے پہل متعارف کرایا- تاہم ہم دیکھتے ہیں کہ تاریخی موضوعات پر اس کی اپنی تحریریں اس نئے تصور کی مثال بن کر سامنے نہیں آتیں- اس کے بجائے وہ روایتی طرز کی ہیں- حقیقت یہ ہے کہ وہ تاریخ نگاری کے طریقہ کار اور مقصد کے بارے میں جو کچھ بھی کہے، خود اس نے تاریخی موضوعات پر قلم اٹھاتے ہوئے پہلی صدی قبل مسیح کے یونانی مورخ پلوٹارک کو نمونہ بنایا ہے- اور پلوٹارک کا معاملہ یہ ہے کہ اس نے تاریخ کو شخصیت نگاری بنا رہا تھا- تاریخ نگاری کے اپنے طریقہ کار کا ذکر کرتے ہوئے والتیئر نے ایک بار اعتراف کیا تھا کہ وہ، مثال کے طور پر، بیکن کی زندگی کے سچے حالات بیان کرنے پر اس کے متعلق کوئی چٹکلا دہرانے کو ترجیح دے گا- یہی تو وہ انداز ہے جس کو ہم روایتی قرار دیتے ہیں اور جو تاریخ کے نام پر قصے کہانیاں اور چٹکلے جمع کرنے کا نام ہے- اصل میں یہ ابن خلدون تھا جس نے پہلے پہل تاریخ کو ایک باقاعدہ علم کی صورت دی تھی- مگر یورپ نے مناسب وقت پر اس سے سبق نہ سیکھا تھا- نتیجہ یہ ہے کہ چٹکلے جمع کرنے کا کام پلوٹارک نے شروع کیا تو اٹھارہویں صدی تک کے یورپی مورخ یہی کام کرتے چلے گئے-

اس کے باوجود والتیئر دوسروں سے مختلف ہونے کی خواہش رکھتا تھا اور اس کو یہ شعور بھی تھا کہ مورخ کو سماجی اور معاشی عوامل فراموش نہیں کرنے چاہیں- وہ کہتا تھا کہ تاریخ کی اکثر کتب یا تو مزاحیہ ہوتی ہیں یا پھر وہ قصیدوں کے انداز میں لکھی جاتی ہیں- مورخ اپنے کرداروں کا ویسے ہی ذکر کرتا ہے جیسے مبلغ اپنے وعظوں میں ولیوں کا چرچا کرتا ہے- والتیئر کا خیال تھا کہ اس نے اپنی کتابوں میں قصیدے لکھے ہیں اور نہ ہی خوشامد کی ہے- اس نے تاریخی کرداروں کو مقدس بزرگوں کا درجہ بھی نہیں دیا- اس کی یہ رائے غلط نہ تھی-

سترہویں صدی کے فرانس کی تاریخ لکھنے کے لئے والتیئر نے جو محنت کی وہ ہم کو اس کے نظریہ تاریخ کے بارے میں بہت کچھ بتاتی ہے- وہ چشم دید گواہوں سے حقائق و واقعات، معلومات اور خیالات حاصل کرتا رہا- ایمیلی کی زیر اثر اس کے یہ رائے اور بھی پختہ ہوگئی تھی کہ فوجی اور سیاسی واقعات پر مشتمل تاریخ کے مقابلے میں فلسفیانہ یا سماجی تاریخ اعلیٰ تر ہوتی ہے- چنانچہ فرانس کے تاریخ کے لئے مواد حاصل کرتے ہوئے اس نے فوجی لڑائیوں یا شہزادوں اور نوابوں کی باہمی کشمکش سے زیادہ سماجی، ثقافتی اور ذہنی رہنماؤں کے

بارے میں مواد حاصل کرنے کو ترجیح دی۔ اس کو یقین ہوگیا تھا کہ اہم افراد ہیروز سے عظیم تر ہوتے ہیں۔ اہم افراد سے مراد وہ لوگ ہیں جنہوں نے پسندیدہ اور مفید امور میں کامیابیاں حاصل کی ہیں۔ ان کے مقابلے میں ہیروز سلطنتوں کو بنانے اور تخت وتاراج کرنے والے ہوتے ہیں۔

والتیئر کو تاریخی موضوعات پر لکھتے ہوئے محض سن وار واقعات درج کرنے میں دلچسپی نہ تھی۔ اس کے بجائے وہ منظر کشی کا خواہش مند تھا وہ چاہتا تھا کہ کس عہد کی تاریخ رقم کرتے ہوئے وہ اس عہد کے لوگوں کی روح کو، ان کے مزاج، ان کی کامیابیوں، ناکامیوں، امیدوں، خوفوں اور حماقتوں کو سامنے لے آئے تاکہ ایک جیتا جاگتا زمانہ قارئین کے سامنے آجائے۔ چودھویں لوئی کے زمانے پر لکھتے ہوئے والتیئر نے ایک رہنما اصول یہ بنایا کہ تاریخ کو بادشاہوں کے بجائے قوموں اور معاشروں کا ریکارڈ ہونا چاہیئے۔ اس نے یہ تصور دیا کہ کسی قوم کی تاریخ کسی خاندان کی تاریخ جیسی ہوتی ہے لیکن مورخ کو یہ تاریخ خاندان کے رکن کی طور پر نہ لکھنی چاہیئے۔ والتیئر نے خود اس اصول کی پیروی لوئی چہاردہم کے عہد کی تاریخ لکھتے ہوئے ضرور کی تھی۔ چنانچہ اس نے اس لوئی پر اپنی کتاب ایک فرانسیسی کے بجائے کسی پرتگالی یا جرمن کے انداز میں لکھی۔ اس نے خود سے پوچھا کہ اگر وہ پیرس کے بجائے لزبن یا ہمبرگ میں پیدا ہوا ہوتا تو لوئی چہاردہم کے زمانے کے فرانس (جو اس کے اپنے اوائل عمر کا فرانس تھا) میں اس کو کن باتوں میں دلچسپی ہوتی۔

بلاشبہ کوئی پوچھ سکتا ہے کہ آیا یہ تاریخ نگاری کا کوئی مناسب طریقہ کار ہے یا نہیں؟ مگر ہم کو یہاں اس مسئلے سے دلچسپی نہیں ہے۔ ہم صرف یہ چاہتے ہیں کہ ان مختلف تصورات اور خیالات کو یہاں پیش کردیں جو والتیئر نے تاریخ نگاری کے ضمن میں بیان کیئے اور جنہوں نے آخر کار تاریخ نگاری کی روایتی اسلوب کو مسترد کر کے ایک نیا شعور پیدا کرنے میں حصہ لیا۔

اس حوالہ سے ایک اور بات بھی قابل ذکر ہے۔ روایتی مورخین کا کہنا تھا کہ مورخ کا کام بس یہ ہے کہ وہ جس عہد یا شخصیت کی تاریخ لکھ رہا ہے، وہ اس کی بارے میں ایسی تمام باتیں فراہم کردے جو درست ہیں۔ والتیئر نے اس سے اختلاف کیا اور انتخاب کرنے کے طریقہ کار پر اصرار کیا۔ اس نے کہا کہ اچھے شاعر اور ادیب جب اپنی کلیات مرتب

کرتے ہیں تو رطب ویابس کو الگ کردیتے ہیں (خوش بخت والتیئر ہمارے شاعروں کی کلیات دیکھنے سے محروم رہا تھا) مورخ کو بھی اسی طرح کانٹ چھانٹ سے کام لینا چاہیئے اور تمام دستیاب مواد کو کتاب میں ٹھونس دینے کے بجائے اس کا صرف وہی حصہ محفوظ کرنا چاہیئے جو محفوظ کرنے کے قابل ہو یا جو آنے والے زمانوں اور نسلوں کے لئے اہمیت کا حامل ہو- اس کا کہنا تھا کہ مانا کہ جو کچھ تاریخ میں شامل کیا جائے وہ درست ہونا چاہیئے- لیکن فضول اور لایعنی تفاصیل کو محفوظ کرنا نری حماقت ہے-

روسو نے اعلان کیا تھا کہ انسان آزاد پیدا ہوا ہے لیکن حکومتوں اور تہذیب نے اس کی آزادی چھین لی ہے اور اس کو غلام بنا دیا ہے- والتیئر کو اس نظریے سے اختلاف تھا- وہ دعوی کرتا تھا کہ انسان کم وبیش ہر جگہ ایک جیسے پیدا ہوتے ہیں- یہ حکومتیں ہیں جو ان کے آداب بدلتی ہیں- وہ قوموں کو بلندی تک پہنچادیتی ہیں یا پھر پستی میں گرا دیتی ہیں- انسانی فطرت اور انسانی اقدار پر اس کا یہ پختہ یقین اور اضافیت پسندی کو قبول کرنے میں اس کی ناکامی کو مورخ کے طور پر اس کی بڑی خامی سمجھا جاسکتا ہے- بات یہ ہے کہ اس کا ذہن خیالات سے بھرا ہوا تھا- وہ ان میں مگن رہتا اور انہی کو درست مانتا تھا- وہ دوسرے خیالات واقعات اور افراد کو اپنے خیالات کے حوالے سے دیکھتا تھا اور خود کو معیار بنا کر فیصلے کرتا تھا- یوں اس سے کئی غلط فیصلے بھی ہوئے-

اس خامی کا شعور رکھتے ہوئے بھی ہم نہیں بھول سکتے کہ والتیئر یورپ کے ان علما کی پہلی نسل سے تعلق رکھتا تھا جنہوں نے پہلے پہل دوسری تہذیبوں کا کسی قدر ہمدردی کے ساتھ مطالعہ کیا تھا، وہ مسیحی یا یورپی تہذیب کو بہترین ماننے اور اس کو معیار بنا کر دوسری تہذیبوں کو پرکھنے کے خبط میں مبتلا نہیں تھا- یہی وجہ ہے کہ اس نے عرب اور چینی تہذیبوں کو مناسب مقام دیا اور مذاہب کے تقابلی مطالعے پر بھی قلم اٹھایا جو اس زمانے میں ایک قسم کا ممنوعہ موضوع تھا- تاہم معلومات، بلکہ یوں کہیے کہ صحیح اور معروضی معلومات کی کمی کے باعث اس کی تحریروں میں بہت سی خامیاں رہ گئیں- پھر جیسا کہ ابھی ہم نے کہا وہ اپنے خیالات کے بوجھ تلے دبا ہوا تھا- یہی وجہ ہے کہ وہ زوردار طریقے سے پرچار کرتا ہے کہ انسانی تاریخ جرائم، حماقتوں، وحشتوں اور بربادیوں کے ریکارڈ کے سوا کچھ نہیں- مگر انسان ایک ایسے زمانے کی طرف بڑھ رہے ہیں جس میں عقل ہر شے میں نظم وضبط پیدا کردے

گی- وہ تاریخ لکھتے ہوئے توہمات کے خلاف جہاد کونظر انداز نہیں کرتا- جو شے بھی اس کو معمول سے ہٹ کر دکھائی دیتی، وہ اس کو توہم قرار دے کر مسترد کر دیتا تھا-

اپنے ذہن میں اس نے یہ تصویر بنا رکھی تھی کہ انسانی تاریخ میں اعلیٰ ثقافتی کامیابیوں کے چار دور گزرے ہیں- سب سے پہلے پیری کلیز کا ایتھنز تھا- اس کے بعد آگسٹس کا روم، پھر احیائے علوم کا اٹلی اور آخر میں خود اس کے اوائل عمر، یعنی چودھویں لوئی بادشاہ کے عہد کا فرانس- تاہم اس نظریے کی تائید کے لئے اس کے پاس دلائل تھے اور نہ ہی شہادتیں- وہ وضاحت کے ساتھ بھی نہ بتا سکا کہ اعلیٰ ثقافت کیسے جنم لیتی ہے، پروان چڑھتی ہے اور پھر زوال پذیر کیوں ہوجاتی ہے-

یہ بحث زیادہ تجریدی اور پیچیدہ ہوتی جارہی ہے- اور یہ وہ انداز ہے جو والتیئر کو پسند نہ تھا- تو آیئے اس بات کو یہ کہتے ہوئے ختم کریں کہ آج کے پیشہ ورانہ معیاروں کے حوالہ سے ہم دیکھیں تو مورخ کے طور پر والتیئر کی خوبیاں اس کی خامیوں اور کمزوریوں سے زیادہ تھیں- بے شک وہ پیشہ ور مورخ نہیں تھا- وہ اپنے مقاصد، خیالات اور نقطہ نظر کے حوالے سے تاریخی موضوعات پر قلم اٹھاتا تھا- پھر بھی ان کتابوں کی اہمیت قائم ہے- مواخذ کے محتاط استعمال کے طریقوں اور اپنے تنقیدی رویوں کے باوجود وہ انیسویں صدی کے بڑے حصے تک کے اکثر مورخین کو زیادہ متاثر نہ کر سکا تھا- وہ صاحبان اس پر نکتہ چینی کرتے رہے تھے- تاہم ان کے جانشینوں کے رویے میں نرمی ہے- اس کی وجہ یہ ہے کہ وہ اپنے ماخذوں پر فہم عامہ اور متشکک عقل کا اطلاق کرنا چاہتا تھا- اس نے تاریخ نگاری میں جنگ، سفارت کاری اور سیاست کو نظر انداز نہ کیا تھا- تاہم ساتھ ہی ساتھ اس نے معاشی، سماجی، ذہنی اور ثقافتی عوامل پر بھی توجہ دی- اہم بات یہ بھی ہے کہ اس نے تاریخ میں عام لوگوں کے کردار کو نظر انداز نہیں کیا تھا-

8

پروشیا کا بادشاہ

سائرے کی خوابناک دنیا میں والتیئر زندگی کی مسرتیں سمیٹ رہا تھا کہ اگست1736 میں عزت مآب فریڈرک کا خط اس کو ملا جو پروشیا کا ولی عہد تھا اور جس کو آنے والی نسلوں نے فریڈرک اعظم کے نام سے یاد کرنا تھا- تب والتیئر کی عمر بیالیس سال ہونے والی تھی فریڈرک چوبیس سال کا تھا اور سخت گیر باپ اور مطلق العنان بادشاہ کے سائے میں دن گزار رہا تھا-

اس سخت گیر ماحول میں، شاید اپنی ذات کے اظہار کے مواقع کی تلاش میں نوجوان شہزادہ ادب اور فنون میں گہری دلچسپی لینے لگا تھا- اس کے بہت سے خیالات والتیئر سے ملتے تھے اور شہزادہ شاید یہ خواب دیکھنے لگا تھا کہ وہ والتیئر کے ساتھ مل کر فلسفہ اور ثقافت کو فروغ دے گا- اس زمانے میں وہ فرانسیسی زبان کے عظیم شاعر اور نثر نگار کا مقام حاصل کرنے کے خواب بھی دیکھا کرتا تھا یہ وہ باتیں تھیں جنہوں نے اس کو والتیئر سے ربط پیدا کرنے پر مائل کیا- اپنے خط میں اس نے لکھا! ”جناب مجھے آپ سے ذاتی واقفیت کا شرف تو حاصل نہیں- لیکن میں آپ کی کتابوں کے حوالے سے آپ کو جانتا ہوں- آپ کی کتابیں ذہانت کا خزانہ ہیں-“

یہ خط اٹھارہویں صدی کے یورپ کی دو عظیم شخصیات کے مابین تعلق کی بنیاد بن گیا-

والٹیئر اس زمانے کا عظیم ترین اذہینیس تھا اور فریڈرک یورپ کا سب سے طاقتور بادشاہ۔ پہلا خط لکھنے کے صرف چار سال بعد وہ پروشیا کا بادشاہ بن گیا۔ لیکن والٹیئر کے ساتھ جو تعلق قائم ہوا تھا وہ آئندہ کئی برسوں تک قائم رہا اس تعلق نے والٹیئر کو عزت واحترام عطا کیا اور بالآخر اس کی توہین کا باعث بھی بنا۔

اپنے ایک اور خط میں والٹیئر نے لکھا تھا کہ ''یہ خیال ذہن میں نہ لایئے گا کہ میں انتہا کا تشکیک پسند ہوں۔ میں آپ سے کہوں کہ، مثال کے طور پر، میرا ایمان ہے کہ خدا صرف ایک ہے اور دنیا میں والٹیئر بھی بس ایک ہی ہے۔'' اس سے والٹیئر کی بارے میں اس کی رائے معلوم ہوجاتی ہے۔ جہاں تک والٹیئر کا تعلق ہے۔ اس تعلق کے ابتدائی برسوں میں وہ بھی فریڈرک کے بارے میں اچھی رائے رکھتا تھا۔ شاید ہم کہہ سکتے ہیں کہ ابھی اس نے شاہ پروشیا کی شخصیت کا صرف ایک روپ دیکھا تھا...... یعنی خوش گوار روپ۔ وہ علوم وفنون کا سر پرست، فلسفی اور شاعر تھا اور طاقتور بادشاہ تھا اور اس نے والٹیئر کو دوستی کا اعزاز اس وقت بخشا تھا جب کہ اپنے ملک میں وہ مجرم سمجھا جاتا تھا اور جسے جلاوطن ہونا تھا۔

فریڈرک تخت نشین ہوا تو یورپ کے کئی فلسفیوں نے گھی کے چراغ جلائے۔ وہ سمجھ رہے تھے کہ براعظم کے ایک تخت پر ایسا بادشاہ رونق افروز ہوگیا ہے جو ان کے خیالات کو عملی روپ دے گا اور جو والٹیئر کا دوست بھی ہے۔

نیا بادشاہ والٹیئر کو اپنے دربار میں بلا لیتا مگر راہ میں مادام گیبریل ایمیلی شاتیلیت حائل تھی۔ وہ والٹیئر کو سائرے کی جنت سے قدم باہر نکالنے نہ دیتی تھی۔ تو کیا بادشاہ مادام کو بھی اپنے پاس نہیں بلا سکتا تھا؟ شاید نہیں۔ اس کو صرف اپنی جنس کے عظیم افراد سے دلچسپی تھی۔ خیر، اس کی طرف سے مسلسل بلاوے آتے رہے۔ یہاں تک کہ نومبر1740 میں والٹیئر نے اس کے پاس برلن جانے کی دعوت قبول کر لی۔ اسی مہینے وہ برلن پہنچا اور فریڈرک سے مل کر بہت متاثر ہوا۔ وہ فلسفی بادشاہ کی طرح پیش آیا تھا اور اپنے مہمان کی بہت خاطر داری کی تھی۔ دونوں میں پر جوش ملاقاتیں رہیں، اور مستقبل کے بعض منصوبے بھی بنائے گئے۔ اسی سال دسمبر کے پہلے ہفتے میں والٹیئر برلن سے نکلا اور واپس چلا آیا۔

یہ چند ہفتوں کا سفر تھا۔ مگر مادام ایمیلی کو توہین کا احساس ہورہا تھا۔ سائرے میں وہ اس بات پر تلملا رہی تھی کہ والٹیئر اس کو چھوڑ کر ایک بادشاہ سے ملنے چلا گیا تھا۔ خیر، انہی

دنوں مادام نے والتیئر کی ساتھ ایک اچھا سلوک بھی کیا- اس نے اپنے اثرورسوخ سے کام لے کر والتیئر کو دارالحکومت پیرس واپس جانے کی اجازت دلوا دی-

والتیئر ایمیلی کے پاس سائرے لوٹ آیا- اب فریڈرک کا ایک اور روپ سامنے آرہا تھا- کوئی شخص یہ پیشین گوئی نہ کرسکتا تھا کہ شاعروں اور فلسفیوں کا مداح یہ بادشاہ جس نے اقتدار میں آنے سے پہلے میکیا ولی کے خلاف ایک جوشیلی نظم لکھی تھی، وہ اٹھارہویں صدی کی یورپ کے بادشاہوں میں سے سب سے زیادہ سولہویں صدی کے اس مکار اطالوی مدبر کا چیلا ثابت ہوگا- مگر اب اس نے تخت پر بیٹھنے کے چند ہی ماہ بعد رنگ بدلنا شروع کردیا-1741 میں اس نے آسٹریا پر چڑھائی کردی- آسٹریا کے ساتھ فرانس کی پرانی دشمنی چلی آرہی تھی- جب اس نے آسٹریا پر قبضہ کرلیا تو فرانس میں بہت سے لوگوں نے خوشی منائی- والتیئر بھی ان میں شامل تھا-

آخراس کے دل میں طاقتور بادشاہ کی دوستی سے فائدہ اٹھانے کا خیال آ گیا- اس نے سوچا کیوں نہ وہ سفارت کار بن جائے- خود اپنے ملک کی طرف سے اس کو موقع مل رہا تھا-1743 سے فرانسیسی دربار یہ جاننے کا آرزومند تھا کہ آیا انگلستان کے خلاف جھگڑے میں اس کو فریڈرک کی مدد مل سکتی ہے- اس بارے میں معلومات حاصل کرنے کا کام والتیئر کو سونپا گیا- وہ اگرچہ دربار کے نزدیک ناپسندیدہ اور ناقابل اعتماد تھا- مگر سب جانتے تھے کہ پروشیا کا بادشاہ اس کا مداح ہے- لگتا ہے کہ خود والتیئر بھی دربار میں اثرورسوخ حاصل کرنے کی خاطر اس موقع سے فائدہ اٹھانے کے لئے بے تاب تھا- وہ فریڈرک سے ملنے خفیہ مشن پر روانہ ہوگیا-

دونوں کی ملاقات پوٹس ڈیم کے مقام پر ہوئی- بادشاہ نے فلسفی کا پرتپاک استقبال کیا- اس کو ان شہزادیوں اور حسیناؤں سے ملوایا گیا جن کے لئے جواں سال بادشاہ نے عشقیہ نظمیں لکھی تھیں- اس کے اعزاز میں بہت سی دعوتیں ہوئیں اور راگ ورنگ کی محفلیں سجائی گئیں- ان دنوں کو یاد کرتے ہوئے والتیئر نے ایک بار لکھا تھا کہ" مجھے ایسے محل میں ٹھہرایا گیا جہاں پادریوں نے کبھی قدم نہ رکھا تھا- وہاں سنجیدہ بحثوں اور خوش گپیوں کی محفلیں آراستہ ہوتیں- مجھے وہاں ایسا ماحول ملا جو اس زمانے میں کہیں اور دستیاب نہ تھا- ان محفلوں میں ہم انسانی توہمات پر کھل کر باتیں کرتے- بے شک ہم خدا کا احترام کرتے

تھے لیکن ان تمام لوگوں کو معاف نہیں کیا جاتا تھا جنہوں نے خدا کے نام پر انسانوں کو دھوکے دیئے ہیں۔"

سوانح نگاروں نے لکھا ہے کہ ابتدا میں فریڈرک اپنے مہمان کے ساتھ سیاسی امور پر بھی کھل کر باتیں کیا کرتا تھا۔ مگر جلد ہی اس کے دل میں وسوسے ڈال دیئے گئے کہ والتیئر اپنے ملک کے لئے جاسوسی کر رہا ہے۔ خیر، ہوا یہ کہ جب والتیئر نے میزبان کو اپنی آمد کے مقصد سے آگاہ کیا تو وہ عیار بادشاہ طرح دے گیا۔ اس سوال پر کہ آیا فرانس انگلستان کی خلاف اس کی مدد پر بھروسہ کر سکتا ہے، فریڈرک نے چند شعر جواب میں سنا دیئے۔ یوں ہمارا شاعر سفارت کار بادشاہ کی شاعری کا گول مول سا نمونہ لے کر لوٹ آیا۔

ظاہر ہے کہ کسی اہم سیاسی سوال کے جواب میں جب بادشاہ شاعری پر اتر آئیں تو اس کا مطلب یہی ہے کہ وہ سنجیدہ نہیں ہیں، بات کو ٹالنا چاہتے ہیں اور کوئی کومٹ منٹ کرنے سے گریزاں ہیں۔ یوں ہم دیکھتے ہیں کہ والتیئر نے جس مقصد کے لئے پروشیا کا سفر کیا تھا، وہ ناکام ہو گیا۔ مگر بڑی مہموں میں ناکامی بھی کئی چھوٹی موٹی کامیابیوں کی راہ کھول دیا کرتی ہے۔ والتیئر کو بھی اس اہم مہم میں ناکامی کے فائدے پہنچے۔ سب سے بڑی بات یہ ہوئی کہ پیرس کی اقتدار اعلی کی غلام گردشوں میں اب تک اس کو باغی، خطرناک دشمن اور ناقابل برداشت فرد سمجھا جاتا رہا تھا، لیکن اب یہ رویہ بدل گیا۔ دربار میں اس کی پذیرائی ہونے لگی اور اس کو ذمہ دار شخص مانا جانے لگا۔ یوں اچانک ہی وہ درباری اور پسندیدہ شخصیت بن گیا۔

اس تبدیلی کے دو تین اسباب تھے۔ اول یہ کہ سفارتی مشن کی ناکامی کے باوجود اس میں والتیئر کا رول اہم تھا۔ اور صاحبان اقتدار نے دیکھا کہ وہ ذمہ داری ادا کرنے کے اہل تھا۔ دوسری بات یہ تھی کہ ان دنوں دربار میں ایک فلسفی پادری ایم۔ ڈی۔ آرگنس کو اثر ورسوخ حاصل تھا۔ اور وہ طالب علمی کے ایام سے والتیئر کا دوست تھا۔ اس نے والتیئر کو آگے بڑھنے میں مدد دی۔ وہ اس قدر صاف گو تھا کہ اہل دربار نے اس کو "آرگنس بے وقوف" کا نام دے رکھا تھا۔ اس کے علاوہ بعض دوسرے دوست بھی اس معاملے میں سرگرم تھے اور چاہتے تھے کہ والتیئر کو شاہی دربار میں عزت واحترام حاصل ہو جائے۔ ان لوگوں میں سے مادام دی پومپاڈور کی کوششیں خاصی اہم تھیں۔

ایک اور وجہ بھی تھی اور اس کو سب سے اہم سمجھنا چاہیئے- وہ وجہ یہ تھی کہ والتیئر اب پچاس سال کا ہو چکا تھا- یہ وہ عمر ہوتی ہے کہ جب آدمی کو بڑھاپے کی آمد اور اپنی توانائیوں کے زوال پذیر ہونے کا خوف لاحق ہو جاتا ہے اور وہ معاشرے میں اپنا مقام بنانے اور دوسروں سے خود کو منوانے کی زیادہ شدت سے آرزو کرنے لگتا ہے- والتیئر کو اپنی ذہانت پر ناز تھا، وہ درجنوں کتابیں، ڈرامے، کہانیاں اور نظمیں لکھ چکا تھا- اس کے مداحوں کا حلقہ پورے یورپ میں پھیل رہا تھا- لیکن فرانس کے بااثر اداروں نے ابھی تک اس کو تسلیم نہ کیا تھا- خطابات اور اعزازات والے معاشرے میں رہتے ہوئے بھی وہ ان سے بالکل محروم تھا- عمر کی اس منزل پر پہنچ کر اس نے بھی اعزازات حاصل کرنے چاہے- مگر خطابات، اعزازات اور بااثر اداروں کی طرف سے اعترافات اس وقت ملتے ہیں جب ان کے تقاضے پورے کئے جائیں- لگتا ہے کہ والتیئر یہ تقاضے پورے کرنے پر آمادہ ہو گیا تھا- اس کے رویوں میں قدرے نرمی پیدا ہوئی اور کل کا باغی آج سمجھوتوں پر تیار ہو گیا-

اعزازات جلد ہی نازل ہونے لگے- پہلے تو والتیئر کو شاہی دربار میں جنٹلمین ان آرڈی نیری کا رتبہ دیا گیا- پھر کچھ عرصہ بعد اس کو شاہی مورخ مقرر کر دیا گیا- یہ عہدہ بادشاہ اور امرا کی طرف سے اس پر بڑے اعتماد کا اظہار تھا شاہی دستاویزات خانہ اس کے سپرد کر دیا گیا اور بادشاہ، یعنی پندرہویں لوئی، نے اس کو اپنے کارناموں کی تاریخ مرتب کرنے کا فرض سونپا-

ایک اور تمنا اس کے جی میں تھی- وہ فرینچ اکارمی کا رکن بننا چاہتا تھا- مگر اکارمی پر تنگ نظر مذہبی لوگ چھائے ہوئے تھے جب کہ والتیئر نے اپنی بہت سی تحریروں میں مذہب اور مذہبی شخصیات کا مذاق اڑایا تھا- وہ لادین سمجھا جاتا تھا- اکاومی کی دہلیز پر قدم رکھنے کے لئے ایمان کا اقرار نامہ لازم تھا- والتیئر یہ بھی کر گزرا- اکاومی کے سربراہ کی نام اس نے ایک خط لکھا جس میں اس نے بتایا کہ وہ مذہب کا احترام کرتا ہے اور خود یسوعی فرقے سے وابستہ ہے- اس کو اکاومی کا رکن بنالیا گیا-

یہ 1746 کا سال تھا-

معلوم ہوتا ہے کہ یہ دنیاوی اعزازات حاصل کرنے کے بعد اس کی ذہن میں ایک کشمکش شروع ہو گئی تھی- اس نے اپنی فطرت پر جبر کیا تھا- جلد ہی اس کی فطرت کو ردعمل

ظاہر کرنے کا ایک ایسا موقع مل گیا جس کے نتیجے میں شاہی عہدہ اور اکادمی کی رکنیت بھی کام نہ آئی- والتیئر ایک بار پھر باغی قرار دیا گیا-

یہ واقعہ پندرہویں لوئی کے محل میں پیش آیا- جہاں والتیئر اور ایمیلی ملکہ کے ساتھ تاش کھیل رہے تھے- ایمیلی کو مسلسل مات ہورہی تھی اور وہ زچ ہورہی تھی والتیئر اس کیفیت کو محسوس کررہا تھا- ہمت بڑھانے کی خاطر اس نے انگریزی زبان میں مادام سے سرگوشی میں کہا ''دل چھوٹا نہ کرو- تم لفنگوں کے ساتھ کھیل رہی ہو-''

یہ جملہ تمام شرکائے محفل کے لئے سخت توہین آمیز تھا- وہ سن لیا گیا اور والتیئر کی توقع کے خلاف، سمجھ بھی لیا گیا- نتیجہ یہ ہوا کہ محفل پر یکدم سناٹا چھا گیا- والتیئر اور ایمیلی جان گئے کہ کھیل بگڑ گیا ہے- دونوں پر خوف طاری ہوگیا- باستیل کا بندی خانہ والتیئر کی آنکھوں کے سامنے گھومنے لگا- اسی رات کو اندھیرے میں دونوں پیرس سے بھاگے اور سکیوکس کا رخ کیا جہاں مین کے نواب کا محل تھا-

یہ فطری پناہ گاہ تھی- یوں جانیئے کہ گویا یہ ایک قسم کا ''مخالف دربار'' تھا- ڈیوک آف مین بادشاہ لوئی چہار دہم کا بیٹا اور اس بادشاہ کا بھائی تھا جس کے دروبار سے یہ دونوں بھاگ کر آئے تھے- اس محل میں اصل راج ڈیوک کی بیوی کا تھا جو ایک بڑے خاندان سے تعلق رکھتی تھی اور اپنے بزدل شوہر کو بلندیوں پر اڑتا ہوا دیکھنا چاہتی تھی- جب لوئی چہار دہم اس جہاں فانی سے رخصت ہوا تو ان میاں بیوی کو تخت ملنے کی بڑی امیدیں تھیں- یہ تاثر بھی پایا جاتا تھا کہ آنجہانی لوئی اسی بیٹے کو جانشین بنانا چاہتا تھا- مگر دربار والے اس سے خوش نہیں تھے- ان کی ناخوشی آخر کار فیصلہ کن رکاوٹ بن گئی- اس لئے وہ تخت وتاج سے محروم رہ گیا-

ڈیوک صاحب خود تو شاید صدمہ سہہ جاتے مگر ان کی بیوی کے لئے یہ ناقابل برداشت تھا- محرومیاں کئی طریقوں سے اپنی تسکین کی راہ ڈھونڈا کرتی ہیں- ان میں سے بعض طریقے بڑے بھونڈے اور مضحکہ خیز ہوتے ہیں لیکن انسان ان کو اختیار کرنے پر بھی مجبور ہوجاتا ہے- نواب بیگم نے یہ طریقہ ڈھونڈا کہ وہ پیرس سے نکل کر سکیوکس آگئیں اور یہاں اپنا ایک، دربار، قائم کرلیا- کئی شاعر، فلسفی، لفنگے اور پتے باز اس دربار کی رونق بڑھانے کے لئے آنکلے تھے-

ہمارے پاس ایک خاتون کا جملہ محفوظ ہے جس نے اس دربار میں والٹیئر اور مادام ایمیلی کی آمد کا حال اپنی آنکھوں سے دیکھا تھا- وہ کہتی ہے کہ "رات کے اندھیرے میں وہ بھوتوں کے جوڑے کی طرح یوں آ نکلے جیسے سیدھے قبر سے بھاگ کر آ رہے ہوں-"

ان بھوتوں کی آمد سے مخالف دربار میں ایک نئی رونق پیدا ہو گئی- والٹیئر پر اگرچہ باستیل کا خوف اب بھی طاری تھا اور وہ پیرس سے دور رہتے ہوئے بھی بادشاہ کی پولیس کی آمد کا خطرہ محسوس کرتا تھا اور اس خطرے کے باعث راہ سے ہٹ کر ایک چھوٹی سی عمارت میں رہنے پر مجبور ہوا تھا، لیکن اس کی زندہ دلی کم نہ ہوئی تھی- وہ اس دربار کی رونق بن گیا- وہ پرانے طور طریقے تھے جن کے ذریعے وہ نئے میزبانوں کا دل بہلانے لگا- یہاں اس نے چند فلسفیانہ قسم کی کہانیاں لکھیں جن میں سے ہر کوئی کسی اخلاقی سچائی کو ثابت کرتی تھی- وہ یہ کہانیاں دربار میں پڑھ کر سناتا اور کسی عظیم اداکار کی طرح ایکٹنگ کرتا- سننے والے داد دیئے بغیر نہ رہ سکتے تھے-

سرما کے دن آئے تو وہ دونوں سائرے لوٹ گئے-

9

محبوبہ کی موت

سائرے میں زندگی دوبارہ معمول پر آ گئی- مادام ایمیلی نے اپنے سائنسی تجربے اور مطالعے شروع کر دیئے- والتیئر تو پیدا ہی لکھنے کے لئے ہوا تھا- وہ اپنے کام میں مگن ہو گیا- مہمان بھی آنے جانے لگے- شامیں اور راتیں پہلے جیسی رنگین اور مسرت انگیز تھیں- مگر تقدیر اب مادام کو موت کی طرف آہستہ آہستہ دھکیلنے لگی تھی- موت کی طرف لے جانے والے عمل کا آغاز ایک دعوت نامہ کی صورت میں آیا-

یہ دعوت نامہ لورین سے آیا تھا جہاں فرانس کی ملکہ کے باپ اور پولینڈ کے سابق بادشاہ سٹین سلاس لیکزنسکی نے اپنا ایک چھوٹا سا دربار سجا رکھا تھا- اس دربار میں دو بڑے کردار تھے- ایک تو میناؤ نامی پادری صاحب تھے اور دوسری دربار کی محبوبہ دی بوفلز تھی- دونوں ایک دوسرے کے دشمن تھے1749 کے لگ بھگ پادری نے محبوبہ کا پتہ کاٹنے کی ایک چال سوچی- اس کو خیال آیا کہ اگر کسی طور مادام ایمیلی دربار میں آ جائے تو دے بوفلز سے نجات مل سکتی ہے- چنانچہ مادام اور والتیئر کو لورین کے دربار میں قیام کی دعوت بھیجی گئی-

دونوں چلی آئے- اور سابق بادشاہ کا دل سابقہ میزبانوں کی طرح کھیل تماشوں سے بہلانے لگے- پادری ان کی کمال دیکھ کر خوش تھا- وہ سمجھ رہ تھا کہ اس دربار کے مالک کے دل پر راج کرنے کے لئے مادام ایمیلی خود ہی دے بوفلز کی رقیب بن جائے گی اور اس کو

پیچھے دھکیل دے گی- شاید ہونا بھی یہی چاہیئے تھا- مگر ہوا اس کے الٹ- دونوں عورتیں رقیب بننے کے بجائے ایک دوسرے کی دوست بن گئیں-

لورین کے اس دربار میں ایمیلی کی ملاقات سیاں لامبریت سے ہوئی ایمیلی اس سے ملی اور گرویدہ ہوگئی- سیاں کی عمر اس وقت33 سال تھی اور وہ شہزادہ دی بیوواؤ کی رجمنٹ میں کپتان تھا- وہ شعر کہتا تھا اور محبت کرنے کے گر جانتا تھا- خیر، وہ کوئی اچھا شاعر نہ تھا- مگر اس میں ایسی کوئی کشش ضرور تھی کہ عورتیں اس پر مرنے لگتی تھیں- وہ آج بھی یاد کیا جاتا ہے تو اس کی وجہ اس کی شاعری ہے اور نہ ہی کوئی فوجی کارنامہ- بلکہ اس کا نام ہم تک اس لئے پہنچا ہے کہ وہ اپنے زمانے کی دو بڑی ذہین شخصیتوں، والتیئر اور روسو کا رقیب بن گیا تھا- وہ گویا اردو شاعری والا رقیب تھا جو محبوباؤں سے ملا اور ان کو لے اڑا-

لورین کے دربار میں ایمیلی اور سیاں لامبریت کے درمیان محبت کی پینگیں بڑھنے لگیں- والتیئر یہ تماشا دیکھ رہا تھا- اس کو امید نہ تھی کہ ایمیلی بے وفائی پر اتر آئے گی- آخر ایک روز اس نے دونوں کو قابل اعتراض حالت میں دیکھ لیا- وہ غصے سے پاگل ہوکر چیخنے لگا- مگر جلد ہی اس نے خود پر قابو پالیا- پچپن سالہ فلسفی جان گیا کہ ایمیلی کو نئے دوستوں کی ضرورت ہے-

چند ہفتوں کے قیام کے بعد والتیئر اور ایمیلی سائرے لوٹ آئے- واپس آتے ہی ایمیلی کو اندیشوں نے گھیر لیا- وہ پنتالیس سال کی تھی، نانی بن چکی تھی اور شوہر ایک مدت سے اس سے دور تھا- اور وہ ماں بننے والی تھی- یہ سیاں کی کارستانی تھی- جب بات بڑھنے لگی تو مادام کے شوہر کو حیلے بہانے سے سائرے بلایا گیا- میاں بیوی تین ہفتے اکٹھے رہے اور پھر مادام نے اعلان کردیا کہ وہ ایک بار پھر ماں بننے والی ہے- مارکیوس کی خوشی کا ٹھکانہ نہ تھا انہوں نے سب کو خوش خبری سنائی-

آنے والے بچے کو باپ کا نام ملنے کا جواز پیدا ہوگیا تھا- مادام کے اندیشے مگر کم نہ ہوئے- اس کو ڈر تھا کہ بچے کی پیدائش اس کی موت کا بہانہ بن جائے گی- خیر یہ مرحلہ بھی خیریت سے طے ہوگیا- ایمیلی نے ایک بچی کو جنم دیا- لیکن موت پیچھا کررہی تھی- پیدائش کے چھٹے روز ایمیلی بیمار ہوئی اور مرگئی-

یہ10 ستمبر1749 کا دن تھا...... والتیئر کی زندگی کا تاریک ترین دن-

وہ مادام کے کمرے سے نکلا- شدت غم سے لڑکھڑایا اور گر پڑا- سیاں لامبریت بھی وہیں تھا- اس نے سہارا دے کر اٹھایا تو کہنے لگا'' آہ نوجوان دوست، تم نے اس کو میرے لئے مار ڈالا-''

انہی دنوں ایک خط میں اس نے اپنا دکھ یوں بیان کیا:

''میں محض ایک محبوبہ سے ہی محروم نہیں ہوا بلکہ خود اپنا آدھا وجود گنوا بیٹھا ہوں میں ذہن سے محروم کر دیا گیا ہوں جس کے لئے میرا ذہن بنا تھا...... بیس سالہ رفاقت ختم ہوگئی ہے-''

یہ خط مادام ڈینس کو لکھا گیا تھا جو والٹیئر کی بھانجی تھی اور جلد ہی مادام ایمیلی کی جگہ لینے والی تھی- وہ والٹیئر کی زندگی میں کردار ادا کرنے والی دوسری اہم عورت تھی-

مادام کی موت سے والٹیئر کے ادبی کیریر کا ایک دور ختم ہوگیا- اگر وہ خود بھی انہی دنوں دنیا سے اٹھ جاتا تو بھی اپنی بعض تحریروں کے باعث اٹھارہویں صدی کے فرانس کے ایک قابل ذکر مصنف کا درجہ پالیتا- بہت سے نقادوں کا کہنا ہے کہ مادام کی رفاقت اس کی ذہنی زندگی کے لئے نقصان وہ ثابت ہوئی تھی اور وہ رفاقت کی طویل مدت کے دوران کوئی بڑا کام نہ کر سکتا تھا- اس رائے کو یکسر رد کرنا دشوار ہے- ہم جانتے ہیں کہ اس کی اہم ترین تصانیف مادام کی موت کے بعد شائع ہوئیں، لیکن یہ نہیں بھولنا چاہیے کہ ان تصانیف کی بنیاد ان ایام میں رکھی گئی تھی جب کہ وہ سائرے کی حویلی میں ایمیلی کے ساتھ دن گزار رہا تھا- ان دونوں کے تعلق کا گہرائی سے مطالعہ کرنے والوں کا کہنا ہے کہ 38-1734 کے زمانے میں والٹیئر شاعر سے فلسفی بن گیا تھا- اس نے نئے خیالات قبول کئے اور اظہار کی نئی صورتیں تلاش کیں- ایمیلی کے زیر اثر اس نے اپنی مشہور فکری کتاب ''مابعد الطبیعیات پر ایک مقالہ'' لکھی- کئی اور فکری تحریریں بھی اس دور سے تعلق رکھتی ہیں-

مادام کی موت کے بعد چند دن وہ سائرے کی حویلی میں سوگ مناتا رہا- یہ وہ حویلی تھی جس کو اچھے دنوں کی مسرت افروز رفاقت نے محبت، دوستی اور علم کا مندر بنا دیا تھا-

پھر وہ پیرس آ گیا-

مادام کے حمل کے دنوں میں بادشاہ فریڈرک کی طرف سے والٹیئر کو بلانے کا اصرار بڑھتا جا رہا تھا- فریڈرک چاہتا تھا کہ والٹیئر مستقل طور پر اس کے پاس چلا آئے- جواب

میں اس نے برلن نہ جانے کے اتنے بہانے تراشے کہ فریڈرک نے ایک بار لکھا کہ اس کو والتیئر کی آمد کی مسیح کی آمد سے بھی کم امید رہ گئی ہے۔ خیر، والتیئر کو جانے میں جو عذر تھا، وہ موت نے ختم کردیا۔ وہ برلن روانہ ہوگیا شاہی دربار میں اس کی شاندار آؤ بھگت ہوئی۔

ہم آسانی کے ساتھ تصور کر سکتے ہیں کہ فریڈرک اعظم کے دوسرے درباریوں کے دل والتیئر کے خلاف حسد وبغض سے بھرنے لگے ہوں گے۔ وہ بادشاہ کی نظموں کی اصلاح کرتا تھا، اس کے ساتھ بحثوں میں شریک ہوتا تھا۔ وہ نکتہ دان اور حاضر جواب تھا۔ محفل کی توجہ کا مرکز بن جانا اس کے لئے بائیں ہاتھ کا کھیل تھا۔ دوسرے درباری منہ دیکھتے رہ جاتے۔ وہ سب پر چھا جاتا۔ آخر کار اس کے خلاف دربار میں کئی گروہ بن گئے۔ وہ سب اس سے نجات چاہتے تھے۔ اور آپ جانتے ہیں کہ چھوٹے اور کینہ پرور گروہوں سے زیادہ خطرناک کوئی نہیں ہوتا۔ انہوں نے مختلف افواہیں پھیلائیں اور بادشاہ کے کان بھرے۔ کئی فرانسیسی بھی اس سازش میں آگے آگئے تھے۔

نزدیکیاں کشش کم کردیتی ہیں۔ بادشاہ کانوں کے کچے ہوتے ہیں۔ یہ دو سچائیاں انسانوں نے صدیوں کی تجربے سے سیکھی ہیں۔ 1750 کے پروشیا کے شاہی دربار میں یہ دونوں سچائیاں والتیئر کے خلاف کارفرما تھیں۔ درباری بن جانے سے فریڈرک اب اس میں پہلے جیسی کشش محسوس نہ کر رہا تھا اور ساتھ ہی ساتھ دوسروں کی کانا پھوسیاں بھی رنگ لانے لگی تھیں۔ ایسے میں چند کوتاہیاں خود والتیئر سے بھی سرزد ہوئیں۔ اصل میں وہ دربار میں بلانے کے لئے بادشاہ کے پرشوق اصرار اور پھر اپنی آمد پر ہونے والے شاعرانہ سلوک کے باعث ضرورت سے زیادہ پراعتماد ہوگیا تھا۔ وہ بھول گیا کہ بادشاہ پہلے بادشاہ ہوتے ہیں۔ شاگرد، دوست یا مداح بعد میں ہوتے ہیں۔

والتیئر کی زندگی کے حالات بتاتے ہیں کہ اس نے درباری اور سیاسی معاملات میں دخل دینا شروع کردیا تھا۔ اور وہ دوسروں کو خاطر میں نہ لاتا تھا۔ اس سے چند ایسی حرکات بھی ہوئیں جن کو برداشت کرنا بادشاہ کے لئے مشکل تھا۔ مثال کے طور پر فریڈرک نے ایک بار محل میں رقص کی دعوت دی۔ اس شاہی دعوت میں روس کے سفیر کے سوا برلن میں مقیم تمام غیر ملکی سفیروں کو مدعو کیا گیا تھا۔ روسی سفیر کو جان بوجھ کر نظر انداز کیا گیا تھا کیونکہ فریڈرک روس کی ملکہ کو مشتعل کرنا چاہتا تھا۔ یہ ایک شاہی چال تھی۔ والتیئر غریب اس کو

جان نہ سکا- اس نے جانا کہ ملکہ کے نمائندے کو محض غلطی کی وجہ سے نہیں بلایا گیا ہے- چنانچہ رقص کے دوسرے روز وہ روسی سفیر کی رہائش گاہ پر گیا اور اس کو سمجھانے لگا کہ وہ اس کوتاہی کا برا نہ مانے- بلکہ اس کو معاف کر دے-

والتیئر کے اقدام کی یہ توجیہ اس کے سیکرٹری نے کی تھی- خود والتیئر کا کہنا یہ تھا کہ وہ صرف بعض کتابوں اور نقشوں پر گفتگو کے لئے سفیر کے ہاں گیا تھا- فریڈرک کے لئے یہ حرکت ناقابل برداشت تھی- والتیئر نے اس کے پاس جا کر اپنی پوزیشن واضح کرنے کی کوشش کی، مگر فریڈرک نے ملاقات سے انکار کر دیا- اس نے والتیئر کو ایک سخت خط لکھا جس میں اس کی غلطیوں کی تفصیل درج تھی- اس نے لکھا تھا کہ:

تم روسی سفیر کے پاس ایسی باتوں کے لئے گئے جن سے تمہارا کوئی تعلق نہ تھا- لوگوں نے یہ جانا کہ گویا میں نے تم کو اس کے پاس بھیجا ہے...... اگر تم فلسفی کی طرح یہاں رہنے پر آمادہ ہو تو مجھے تم سے مل کر خوشی ہو گی- لیکن اگر تمہارے یہی چلن رہے اور تم سب لوگوں سے لڑتے جھگڑتے بھی رہے تو پھر تمہاری یہاں موجودگی میرے لئے خوشی کا باعث نہ ہو گی-''

اس خط کے مندرجات سے ہم اندازہ کر سکتے ہیں کہ بادشاہ اور فلسفی میں بدگمانیاں اس حد تک بڑھ گئی تھیں کہ ان کا ایک ساتھ رہنا دشوار ہو گیا تھا- والتیئر اس صورت حال سے بے خبر نہ تھا- کچھ ہی عرصے بعد اس نے بادشاہ کی طرف سے ملنے والے اعزازات واپس کر دیئے اور اس کی بادشاہت سے نکل جانے کی اجازت کا طلب گار ہوا- اجازت اس کو مل گئی- لیکن واپسی پر جب وہ فرینک زٹ پہنچا تو اس کو گرفتار کر لیا گیا- اس پر مختلف قسم کے الزام لگائے گئے اور اس کو لینے کے لئے آنے والی بھانجی مادام ڈینس کو بھی نظر بند کر دیا گیا- تین ذلت آمیز دنوں کے بعد ان کو جانے کی اجازت دی گئی-

مگر وہ کہاں جاتا؟

وہ بوڑھا ہو رہا تھا لیکن دنیا میں اس کا کوئی گھر تھا نہ کوئی ٹھکانہ تھا- دوست بادشاہ کا ملک اس کو برداشت نہ کر رہا تھا اور اپنے ملک کا بادشاہ اس کو دوبارہ وہاں دیکھنے کا روادار نہ تھا-

خیر، راستے میں وہ چند ہفتوں کے لئے سی نونز کی خانقاہ میں رک گیا جہاں ایک

لائبریری میں اس نے ''اخلاق پر مقالہ'' مکمل کیا- پھر سوئٹزر لینڈ پہنچا- یہ ایک جمہوری ملک تھا جس میں بادشاہ اور شہزادے نہ تھے-12 دسمبر1754 کو وہ جینوا پہنچا- اس نے یہیں رہنے کا ارادہ کیا- عمر بھر وہ دوسروں کے گھروں میں رہا تھا اب کوئی سرپرست نہ تھا تو اس نے اپنے لئے ایک بڑا گھر خرید لیا- حویلیوں اور محلوں میں رہتے رہتے وہ خود بھی نوابوں کی طرح رہنے کا عادی جو ہو گیا تھا-

جینوا میں وہ جھیل کے کنارے رہنے لگا- ژاں ژاک روسو اس زمانے کے جینوا کا ایک مشہور شہری تھا- وہ والتیئر کی آمد کی اطلاع پا کر بہت خوش ہوا- ایک خط میں اس نے لکھا کہ ''والتیئر نہ صرف سب سے زیادہ بذلہ سنج اور تیز فہم ہے بلکہ سب سے زیادہ پسندیدہ اور خوشگوار شخصیت بھی ہے اگر صرف اس کے ذہن کو سامنے رکھا جائے تو پھر ساری زندگی اس کے قدموں میں گزاری جا سکتا ہے-'' جلد ہی روسو نے اس کو ''عدم مساوات پر ایک مقالہ'' کا ایک نسخہ بھیجا-

یہ ایک اچھا آغاز تھا- اس سے معلوم ہوتا تھا کہ والتیئر اور روسو اچھے دوست ثابت ہوں گے- مگر جلد ہی واقعات کا رخ بدل گیا- اپنے ایک مقالہ میں روسو نے والتیئر پر تنقید کی اور وہ خلاف معمول خاموش رہا- ان دونوں میں خط و کتابت جاری رہی لیکن ایک شہر میں رہتے ہوئے بھی دونوں میں کبھی ملاقات نہ ہوئی- انہی دنوں میں لزبن میں تباہ کن زلزلہ آیا جس میں سینکڑوں افراد ہلاک ہو گئے- مختلف لوگ اس تباہی کی مختلف طریقوں سے توجیہ کر رہے تھے- اس معاملے پر والتیئر اور روسو میں بھی اختلاف پیدا ہوا- روسو نے اس بارے میں والتیئر کا خط اس کی اجازت کے بغیر چھاپ دیا تو والتیئر کو بہت رنج ہوا- وہ روسو کو جھگڑالو اور پاگل آدمی سمجھنے لگا- اور جینوا میں رہتے ہوئے بھی اس نے میل جول تک نوبت نہ آنے دی-

والتیئر کا خیال تھا کہ جینوا میں اس کے دن سکون سے گزریں گے- مگر وہاں مخالفوں کا ایک طاقتور گروہ موجود تھا جس کی طرف غالباً اس کا دھیان نہ گیا تھا- یہ گروہ شہر کے پادریوں پر مشتمل تھا- انہوں نے فوراً ہی ''کافر اور ملحد فلسفی'' کے خلاف مہم شروع کر دی- آبائے شہر کے اشارے پر والتیئر نے مصالحت کے بعض حربے آزمائے- مگر بات نہ بنی- جینوا کے کلیساؤں میں اس کے خلاف وعظ ہونے لگے- پادریوں کو اس کی رہائش گاہ میں بنائے جانے والے تھیٹر پر بھی سخت اعتراض تھا جہاں شہر کے بڑے بڑے خاندانوں کے افراد آنے لگے تھے-

ایک اور واقعہ نے گویا آگ ہی لگا دی- ہوا یہ کہ والتیئر نے انسائیکلو پیڈیا کی لئے جینوا

شہر پر ایک مقالہ لکھا- مقالے میں اس نے پروٹسٹنٹ پادریوں کی تعریف کی جو اس کے بقول موحد تھے اور بائبل یا دوزخ پر ایمان نہیں رکھتے تھے- والتیئر کا خیال تھا کہ وہ پادریوں کی تعریف کر رہا ہے- مگر وہ برافروختہ ہوگئے اور انہوں نے والتیئر کو شہر سے نکالنے کی مہم زیادہ تیز کردی- اس نے اپنے دفاع میں کئی تاویلیں کیں- اس نے یہاں تک کہا کہ اس کے مسودے میں ردوبدل کیا گیا ہے اور جو باتیں اس نے نہیں لکھی تھیں، وہ بھی مقالہ میں شامل کردی گئی ہیں-مگر کسی نے اس کی بات نہ مانی-

اس نے جان لیا کہ جینوا، پیرس یا برلن سے زیادہ اس کے لئے سازگار نہیں ہے-

10

پہاڑوں کا بڈھا

والتیئر نے جان لیا کہ بڑے شہروں کا ماحول اس کے لئے سازگار نہیں- پیرس، برلن اور جینوا کے ناگوار تجربوں نے اس کو سائرے کے پرسکون ماحول کی یاددلائی ہوگی- اس نے ایک بار پھر شہروں سے دور بسیرا تلاش کیا- وہ جینوا سے نکلا اور سوئٹزرلینڈ کی سرحد کے قریب فرانس کے علاقہ میں فاغنے کی حویلی خرید لی- اور وہاں رہنے لگا-

اب وہ ساٹھ سال کا ہو چکا تھا- اس کی صحت قابل رشک کبھی نہ رہی تھی- اور صحت کی خرابی کا اس کو زیادہ ہی احساس رہتا تھا- چنانچہ اکثر ملاقاتی کہا کرتے تھے کہ ملاقات کے دوران وہ اپنی صحت کی خرابی کا ذکر کرنا نہیں بھولتا- یہ خرابی اب بھی قائم تھی- مگر اس کے ذہن کی توانائیاں ماند نہ پڑی تھیں- وہ بہت کچھ کرنے کے قابل تھا اور فاغنے میں اس کی صلاحیتوں کا بہترین اظہار ہونے والا تھا- سچ تو یہ ہے کہ آج ہم جس والتیئر کو یاد کرتے ہیں اور جس کے تاریخی کردار کا چرچا کرتے ہیں، وہ فاغنے میں آ کر ہی نمایاں ہوا تھا- اس سے پہلے وہ مشہور شاعر اور ڈرامہ نگار تھا، لوگوں میں زیر بحث رہنے والا مورخ اور نئی سائنس کومقبول بنانے والا مصنف تھا- لیکن آج ہمارے لئے اس کی یہ حیثیتیں غیر اہم ہوچکی ہیں- اب ہم اس کو فلسفی اور دانش ور کے طور پر جانتے ہیں- اس کا یہ روپ زیادہ تر فاغنے میں سامنے آیا-

اس کی زندگی کے باقی ماہ وسال فاغنے میں گزرنے والے تھے- یہ حویلی اس نے اپنی بھانجی مادام ڈینس کے نام پر خریدی تھی جو اس زمانے میں پچاس برس کی ہونے والی تھی اور جلد ہی اس کو اس حویلی کا انتظام اپنے ہاتھ میں لے لینا تھا والتیئر کی ایک اور بھانجی مادام دی فاونتین بھی اس کے پاس اکثر آنے لگی تھی- وہ مصور تھی- اور اس نے ''ماموں کے بوڑھے خون کو گرم رکھنے کی خاطر'' حویلی کو ننگی تصویروں سے بھر دیا تھا- دو اور مستقل مہمان حویلی میں تھے- ایک والتیئر کا سیکرٹری ویگزے اور دوسرا ایک یسوعی پادری فادر ایدم تھا- معلوم ہوتا ہے کہ سکول کے زمانے سے یسوعی فرقہ سے اس کا جو تعلق بنا تھا، وہ پادریوں کی عمر بھر کی مخالفت کے باوجود کمزور نہ ہونے پایا تھا- بہرحال یہ پادری مزے کا آدمی تھا- وہ والتیئر کے ساتھ ہر روز شطرنج کھیلتا- جب کبھی وہ جیتنے لگتا، والتیئر بساط الٹ دیتا- اس کا کہنا تھا کہ '' یہ پادری دنیا کے بڑے آدمیوں میں سے ایک نہ سہی، لیکن میری چال سمجھتا ہے-''

فاغنے کی حویلی میں اس نے ایک تھیٹر، ایک گرجا اور اپنے لئے ایک مزار بھی بنایا تھا- یہ مزار آدھا گرجے کے اندر اور آدھا باہر تھا- وہ کہا کرتا تھا کہ ''بدمعاش میری قبر دیکھ کر کہا کریں گے کہ میں اندر ہوں نہ باہر ہوں-'' حویلی کے گرجے کے بارے میں اس کا کہنا تھا کہ '' تم کسی پارسا سے ملو تو بتاؤ کہ میں نے حویلی میں گرجا بنوایا ہے اور اگر اچھے لوگوں سے ملاقات ہو جائے تو ان کو خوش خبری دو کہ میں نے ایک تھیٹر تیار کیا ہے-''

جب وہ جینوا میں جھیل کے کنارے رہتا تھا تو اس زمانے کے ایک بڑے عالم دیدرو نے ایک بار اس کو ''جھیل کا معزز بٹ مار'' کہہ کر پکارا تھا- حویلی کے پیچھے چھوٹی چھوٹی پہاڑیاں تھیں اور ان کی مناسبت سے اب وہ خود کو ''پہاڑوں کا بڈھا'' کہنے لگا تھا- ہم کہہ سکتے ہیں کہ رہائش کے لئے یہ مقام والتیئر نے خوشی سے نہیں چنا تھا- وہ فرانس کی بجائے کسی آزاد ملک میں رہنے کا آرزومند تھا اور آزادی سے اس کی مراد بادشاہوں اور نوابوں کی عدم موجودگی تھی- لیکن مادام ڈینس رکاوٹ بن گئی- وہ فرانس میں ہی رہنے پر بضد تھی اور خاص طور پر نارمنڈی کے گردنواح میں رہنے کو ترجیح دیتی تھی- والتیئر پر اس کا اثر ورسوخ اس قدر بڑھ گیا تھا کہ وہ انکار نہ کر سکا-

فاغنے کا انتخاب اس کے حق میں اچھا ہی ثابت ہوا- برلن سے نکلنے کے بعد درباری

کے طور پر اس کا کردار ختم ہو گیا تھا- فاغنے میں اس کو آزادی حاصل تھی اور شہروں کے وہ ہنگامے اور دلچسپیاں بھی نہ تھیں جو اس کا وقت اور توجہ کو تقسیم کر دیتیں- انہی دنوں اس نے ظلم وستم کے خلاف پرزور طریقے سے احتجاج کرنا اور اس کے خلاف نفرت کو ظاہر کرنا سیکھا- شاید وہ لاشعوری طور پر اپنے آئندہ کردار کیلئے تیار ہو رہا تھا- اب تک اس کی شخصیت میں کھلنڈرا پن نمایاں رہا تھا- مگر اب وہ تیزی سے اس مقام کی طرف بڑھنے لگا جہاں اس کو ''یورپ کا ضمیر'' قرار دیا گیا- اس نے کہا تھا کہ ''بڑھتی ہوئی عمر کے باوجود میرا جوش وولولہ ختم نہیں ہوا- ظلم رسیدہ معصومیت مجھے بے حد متاثر کرتی ہے اور جب دوسروں کو اذیت دی جاتی ہے تو غصے اور طیش سے میرا خون کھولنے لگتا ہے- میں بے قابو ہو جاتا ہوں-'' جلد ہی وہ تو ہم پرستی اور ضعیف لاعتقادی کے ساتھ ساتھ سیاسی جبر، مذہبی تنگ نظری، عدم برداشت، بے انصافی، ظلم اور ایذا دہی کے خلاف انسانی آزادی اور انسانی احترام کے علمبردار کے طور پر سامنے آنے والا تھا- اس سلسلے میں کیلاس کا سانحہ بہت مشہور ہے جس کا ذکر آگے چل کر آئے گا-

فاغنے میں قیام کے زمانے میں والتیئر نے بہت سا تحریری کام کیا- اس نے دو ایسی کتابیں لکھیں جو اب تک مشہور چلی آ رہی ہیں- ان میں سے ایک ''فلسفیانہ لغت'' ہے اور دوسری کتاب اس کا مشہور ومعروف ناول ''کاندید'' ہے- ہم آئندہ ابواب میں ان کا ذکر کریں گے- یہیں اس نے وہ کام بھی نمٹائے جو سائرے یا پروشیا میں قیام کے زمانے میں اس نے شروع کئے تھے، مگر کسی نہ کسی وجہ سے وہ مکمل نہ ہو پائے تھے- ان میں سے دو کی طرف اشارہ کرنا ضروری ہے- ایک ''اخلاق پر مقالہ'' ہے جس میں والتیئر نے اخلاقیات اور مذہب کے موضوع پر اپنے خیالات پیش کئے ہیں- دوسرے ''پیٹر اعظم کے عہد کا روس'' ہے- جیسا کہ عنوان سے ظاہر ہے، اس کتاب میں والتیئر نے پیٹر اعظم کے زمانے کے روس کی تاریخ مرتب کی ہے- فاغنے میں اس نے کئی فلسفیانہ کہانیاں بھی لکھیں جو دلچسپ ہونے کے علاوہ سبق آموز بھی ہیں ''جیسوئٹ اور کولن'' امرا کے طبقے پر طنز ہے- ''چالیس کراؤن رکھنے والا آدمی'' کو آپ مختصر ناول قرار دے سکتے ہیں- مگر اس میں معاشی مسائل پر بحثیں بھی شامل ہیں- ''چینی کی تاریخ''، ''بابل کی شہزادی''، ''سفید سانڈ'' اور ''سیاہ وسفید'' وغیرہ اس دور میں لکھی جانے والی کہانیاں ہیں- ان میں وہ دلکشی ہے جو ''کاندید'' کو اب

تک ایک زندہ کتاب بنائے ہوئے ہے۔ مگر یہ ضرور ہے کہ ان میں اس ناول جیسی کاملیت نہیں ہے۔

فاغنے میں والتیئر نے اس زمانے کے حالات وواقعات، سیاسی جبراور مذہبی بنیاد پرستی کے خلاف دوجنوں کی پمفلٹ اور مضامین لکھے۔ ان پمفلٹوں نے اس زمانے میں ایک طوفان برپا کر دیا تھا اورعوام میں وہ شعور پیدا کرنے میں زبردست حصہ لیا تھا جو اس کی موت کے صرف دس گیارہ سال بعد فرانس کے انقلاب کی صورت میں پھٹ پڑا۔ ان پمفلٹوں کے اثرات کو پیش نظر رکھتے ہوئے ہم والتیئر کو انسانی تاریخ کے سب سے بڑے پراپیگنڈ کاروں اور صحافیوں میں شمار کر سکتے ہیں۔

یہاں ایک اور بات بھی قابل ذکر ہے۔ فاغنے میں والتیئر نے دواور کام بھی کیے۔ اس نے فاغنے کے گردونواح میں بہت سے درخت لگوائے اور زراعت کو ترقی دی۔ دوسرا کام یہ کیا کہ وہاں محنت کشوں کے لئے ایک کالونی تعمیر کروائی۔ اس نے مزدوروں کے لئے مکانات تعمیر کروائے اور ان کو آسان قسطوں پر مہیا کیے۔ ان کے لئے ایک تھیٹر بھی بنوایا۔ گھڑیاں بنانے والے کاریگروں کو سوئٹزلینڈ سے لاکر آباد کیا۔ یوں فاغنے گھڑی سازی کی صنعت کا ایک مرکز بن گیا والتیئر نے نہ صرف خود اس صنعت کی سرپرستی کی بلکہ اپنے بااثر دوستوں سے بھی اس سلسلے میں مدد حاصل کی۔

ان کوششوں کے نتیجے میں فاغنے کا گاؤں تیزی سے ترقی کرنے لگا اور محنت کشوں کی کالونی پھلنے پھولنے لگی۔ جب والتیئر نے کام شروع کیا تھا تو وہاں صرف چالیس افراد آباد تھے۔ چند برسوں میں ان کی تعداد بڑھ کر بارہ سو افراد تک پہنچ گئی۔ وہ زیادہ تر ہنر مند افراد تھے جو اپنی دانائی، مہارت اور تجربے کو میکانکی فنون کے شعبوں میں بروئے کار لاتے تھے۔

کالونی کے امور میں والتیئر خود بڑھ چڑھ کر حصہ لیتا تھا۔1776 میں جب اس کی عمر 82 سال تھی تو اس کا ایک دوست لیکن اس سے ملنے فاغنے آیا۔ وہ لکھتا ہے کہ بزرگ والتیئر روزانہ دس گھنٹے کام کرتا ہے۔ مویشیوں کے معائنے اور مالی امور کی نگرانی کا کام بھی اس نے اپنے ذمے لے رکھا ہے اور وہ اپنے یہ فرائض باقاعدگی سے ادا کرتا ہے۔

ان معاملات کی وجہ سے والتیئر کو معاشی نظریے سے ایک نئی دلچسپی پیدا ہوگئی۔ اس کا علاقہ زرعی اعتبار سے اچھا نہ تھا اور اس کا بڑا حصہ بالکل بنجر تھا۔ لیکن وہ صنعتی طور پر ترقی کر

رہا تھا- چنانچہ انہی دنوں اپنے ایک مقالہ میں اس نے زراعت کو انسانی سماج کی بنیاد تسلیم کرنے کے ساتھ ساتھ ان لوگوں کی حمایت کی تھی جو کسی رکاوٹ کے بغیر بین الاقوامی تجارت کی حمایت کر رہے تھے- یہاں بھی وہ ارباب مذہب پر چوٹ کرنا نہ بھولا- چنانچہ اس نے کلیسائی ٹیکسوں اور مراعات پر کڑی تنقید کی اور ان کے خاتمے کا مطالبہ کیا- اس کے علاوہ اس نے کسانوں کی حالت بہتر بنانے پر زور دیا- وہ کہا کرتا تھا کہ عام فرانسیسی کسانوں کی حالت امریکہ کی فرانسیسی نو آبادیوں کے کالے غلاموں سے زیادہ مختلف نہیں ہے- ہم سب جانتے ہیں کہ اس کو غلامی سے نفرت تھی-

والتیئر کی شہرت اب پورے براعظم یورپ میں پھیل چکی تھی اور اس براعظم کی اہم ترین شخصیت بن چکا تھا- زندگی کے آخری دس بارہ برسوں کے دوران میں وہ یورپ میں انسانی آزادی، زندگی کے آخری دس بارہ برس کے دوران میں وہ یورپ میں انسانی آزادی، انصاف اور روشن خیالی کی علامت بن گیا تھا- اس کی حویلی یورپ میں نیا شعور رکھنے والوں کے لئے زیارت گاہ بن گئی- والتیئر گویا ایک نئے فرقے کا پیر تھا اور اس کے مرید یورپ کی تمام حصوں سے اس کو خراج عقیدت پیش کرنے کے لئے آنے لگے- بہت سے تو یوں آتے جیسے کسی خانقاہ کے بزرگ کے حضور جا رہے ہوں- وہ والتیئر اور اس کے ساتھیوں کو حیرت اور عظمت کے ملے جلے احساس کے ساتھ دیکھتے-1768 میں اس نے مادام دودیفان کو ایک خط میں لکھا تھا کہ ''چودہ سال سے میں یورپ کا سرائے دار بنا ہوا ہوں- اب اس کام سے تنگ آ گیا ہوں-''

بعض ایسے بھی تھے جو اس کی شہرت سے فائدہ اٹھانا چاہتے تھے- نونٹ نامی ایک یسوعی پادری نے انہی دنوں- تاریخ اور عقیدہ کے حقائق کے بارے میں والتیئر کی غلطیاں'' کے عنوان سے ایک کتاب لکھی تو اس کے ناشر نے والتیئر کو ایک خط میں پیش کش کی کہ اگر وہ خود کو مخالفانہ نکتہ چینی سے محفوظ رکھنا چاہتا تو اس کتاب کا پورا ایڈیشن خرید لے- والتیئر جان گیا کہ یہ بلیک میلنگ ہے- اس نے ناشر کو جواب دیا کہ وہ پہلے ہی اپنی تحریروں میں پائی جانے والی غلطیوں سے آگاہ ہے- لہٰذا اس کو یہ کتاب خریدنے میں دلچسپی نہیں- جب یہ کتاب شائع ہوئی تو والتیئر کے خلاف لکھی جانے والی دوسری کتابوں سے زیادہ مقبول ہوئی- بہت سے لوگوں نے اس کو پڑھا- بہت سے لوگ اس سے متاثر ہوئے ہوں گے-

مگر والتیئر کو پرواہ نہ تھی- اس نے خود یہ کتاب پڑھنے کے بعد کہا کہ ''بلاشبہ اس کتاب میں غلطیوں کو بھر مار ہے- لیکن وہ میری غلطیاں نہیں ہیں-''

11

کاندید

یہ اکثر ہوتا ہے کوئی مصور زندگی میں درجنوں تصویریں بناتا ہے مگر کوئی ایک تصویر اس کی شناخت بن جاتی ہے اور باقی تصاویر بھلا دی جاتی ہیں- ضروری نہیں کہ شناخت بننے والی تصویر مصور کا شاہکار ہی ہو- ممکن ہے کہ خود مصور اس کو دوسرے درجے کی تصویر مانتا ہو-

بہت سے شاعر آخر کار اپنی کسی ایک غزل بلکہ کبھی کبھی تو محض ایک دو شعروں کے حوالے سے یاد رہ جاتے ہیں- اداکار درجنوں فلموں میں اپنے فن کے جوہر دکھاتا ہے، مگر اس کا کوئی ایک کردار ذہنوں پر نقش ہو جاتا ہے- ڈرامہ نگار کئی ڈرامے لکھتا ہے لیکن آنے والی نسلوں کو اس کا کوئی ایک ڈرامہ ہی اچھا لگتا ہے-

والتیئر کے ساتھ یہی معاملہ پیش آیا ہے- اس کی سینکڑوں تحریروں میں سے صرف ''کاندید'' ہی ہے جو اب تک مقبول چلی آ رہی ہے- اکثر لوگوں کے نزدیک اس کی پہچان صرف اس چھوٹی سی کتاب کے حوالے سے قائم ہے-

آپ چاہیں تو اس کتاب کو ''قصہ'' کہہ لیں اور جدید اصطلاح استعمال کرنا چاہیں تو خوشی سے اس کو ناول سمجھ لیجئے- والتیئر کی دوسری تمام تحریروں کے مقابلے میں اس کے ایڈیشن کہیں زیادہ تعداد میں شائع ہوئے ہیں اور دوسری زبانوں میں اس کے تراجم بھی زیادہ ہوئے ہیں- اردو میں بھی اس کا ترجمہ ہو چکا ہے- یہ ترجمہ ادب کی ترقی پسند تحریک کے

رہنما، ظہیر نے کیا تھا اور دہلی کے مکتبہ جامعہ نے اس کو 1957 میں شائع کیا تھا۔

کاندید پہلے پہل فروری 1759 میں شائع ہوئی تھی۔ رواج سا بن گیا ہے کہ اس کتاب کا ذکر کرنے سے پہلے پرتگال کے دارالحکومت لزبن کے ایک ہولناک زلزلے کا حوالہ دیا جائے جو 1755 میں آیا تھا۔ کہتے ہیں کہ والتیئر نے اپنی کتاب اس زلزلے سے متاثر ہو کر لکھی تھی۔ یہ بات پوری طرح درست نہ ہو تو بھی یہ خیال کیا جاسکتا ہے کہ کاندید میں والتیئر نے جن ذہنی رویوں کا اظہار کیا ہے، ان کی تشکیل میں اس سانحہ نے ضرور کوئی نہ کوئی حصہ لیا ہوگا۔ بات یہ ہے کہ یہ ایک یاس انگیز کتاب ہے جو زندگی کے بارے میں ملال انگیز رویے کو سامنے لاتی ہے اور یہ وہ رویہ ہے جو والتیئر کی دوسری تحریروں میں نہیں ملتا۔

لزبن میں زلزلہ ایک مذہبی تہوار، یعنی آل سینٹس ڈے، کو آیا تھا شہر کے گرجے عبادت گزاروں سے بھرے ہوئے تھے۔ دیکھتے ہی دیکھتے قیامت نازل ہوگئی۔ زلزلے کے جھٹکوں سے شہر کی اکثر عمارتیں تباہ ہوگئیں۔ ہزاروں مرد، عورتیں اور بچے عبادت کرتے ہوئے جان سے ہاتھ دو بیٹھے۔ مورخین لکھتے ہیں کہ اس زلزلے میں تیس ہزار سے زیادہ افراد لقمہ اجل بن گئے تھے۔

جب اس ہولناک آفت کی تفصیل والتیئر تک پہنچی تو وہ رنجیدہ ہوا۔ دکھ کی کیفیت میں وہ بار بار خود سے پوچھتا تھا کہ یہ کیسا خدا ہے جو بے نیازی سے مخلوق کو روند ڈالتا ہے۔

اس قسم کی ہولناک آفات کے ردعمل میں اٹھارہویں صدی کے توحید پرست دو نقطہ ہائے نظر اختیار کر سکتے تھے۔ ان میں سے ایک انگریز شاعر الیگزنڈر پوپ نے اختیار کیا۔ اس کا کہنا تھا کہ فطرت کی خرابیاں اس کی فطرت کا حصہ ہیں۔ ان کے خلاف احتجاج کرنا اور ان کی مذمت کرنا فضول سی بات ہے۔ یہ دنیا جس میں ہم رہتے ہیں وہ تمام امکانی دنیاؤں میں سے بہترین ہے۔ اس کے لئے ہم کو خالق کائنات کا مشکور ہونا چاہیئے اور مان لینا چاہیئے کہ جو کچھ یہاں ہوتا ہے، وہ صحیح ہے۔

عام لوگوں کا اور خاص طور پر مذہبی طرز احساس رکھنے والے لوگوں کا موقف بھی یہی تھا۔ چنانچہ والتیئر ، جو ان دنوں سے سوئٹزر لینڈ میں رہتا تھا، کے ایک ہمسائے نے یہی نقطہ نظر اختیار کیا۔ وہ مشہور طبیب اور راسخ العقیدہ مسیحی تھا۔ اس نے کہا کہ لزبن کی تباہی سے خدائی انصاف پر اس کا ایمان مزید پختہ ہوگیا ہے۔

دوسرا نقطہ نظر اس کے بالکل متضاد ہے۔ ہم اس کو یوں بیان کرسکتے ہیں کہ ہولناک تباہی اور انسانی مصائب دیکھ کر بعض ذہنوں میں خدا کی موجودگی کے بارے میں شبہات پیدا ہونے لگتے ہیں۔ وہ یہ سوچتے ہیں کہ خدا کی موجودگی میں انسان ظلم اور بے انصافی کا شکار نہیں ہوسکتے۔ لزبن کی آفت کے ردعمل میں والتیئر کے دل میں یہی وسولہ پیدا ہوا۔ اس نے کائنات کے پیچھے کسی منظّم قوت کی موجودگی اور خدائی انصاف کا تصور مسترد کردیا۔

ان احساسات کا اظہار ایک مشہور نظم کی صورت میں ہوا ہے جو والتیئر نے لزبن کے زلزلے کی خبر سننے کے سات آٹھ دن بعد لکھی تھی۔ اس کا عنوان ''لزبن کی آفت پر نظم'' ہے۔ نظم میں اس نے ماننے سے انکار کیا کہ اس دنیا میں جو کچھ بھی ہورہا ہے، ٹھیک ہورہا ہے۔ اس نظریے کو رجائیت یا امید پرستی کے فلسفے کا عنوان دیا جاتا ہے۔ والتیئر نے اس نظریے کو زندگی کے دکھوں اور مصیبتوں کی توہین قرار دیا۔ وہ وسیع پیمانے پر ہلاکت پھیلانے والی اس آفت کی توجیہ کا مطالبہ کرتا تھا۔ اس نے کلیسائی دانش وروں کو چیلنج کیا کہ وہ بتائیں کہ اگر خدا نے ہماری اس دنیا کو تمام امکانی دنیاؤں میں سے بہترین بنایا ہے تو پھر انسانوں پر ظلم وستم کے پہاڑ کیوں ٹوٹتے ہیں؟ ہزاروں معصوم انسان خدا کی عبادت کرتے ہوئے پل بھر میں ہلاک کیوں ہوجاتے ہیں؟ اہل مذہب نے جو جواب دیئے، وہ والتیئر کو مطمئن نہ کرسکے۔

''لزبن کی آفت پر نظم'' میں دراصل یہ سوال اٹھایا گیا ہے کہ اگر خدا سراپا خیر ہے اور قادر مطلق ہے تو پھر دنیا میں اس قدر ظلم، بے انصافی اور بدی کیوں ہے۔ مکمل قدرت رکھنے والا خدا اس شر کو ختم کرسکتا ہے۔ بات یہ بھی ہے کہ اگر خدا سراپا خیر ہے تو اس کو شر کے خاتمے کی خواہش بھی ہونی چاہیئے۔ سوال یہ ہے کہ خدا شر کو ختم کرنے کی قدرت رکھتا ہے اور اس کا خاتمہ چاہتا بھی ہے تو شر کیوں ختم نہیں ہوتا۔

یہ ایک قدیم معمہ ہے۔ صدیوں سے کم وبیش سبھی تہذیبوں اور عقیدوں سے تعلق رکھنے والے دانش ور اس کو حل کرنے کی کوشش کرتے رہے ہیں۔ مگر سچی بات ہے کہ انہوں نے جو حل تلاش کیئے وہ صرف خود انہی کو مطمئن کرسکے یوں یہ معمہ جوں کا توں چلا آرہا ہے۔

یہ توقع نہ کی جائے کہ جو مسئلہ سینکڑوں ہزاروں دانش وروں سے حل نہیں ہوا، ہم یہاں اس کو حل کردیں گے۔ اس قسم کی کوشش بے سود ہونے کے علاوہ مضحکہ خیز بھی ہوگی۔

زیر بحث موضوع کے حوالہ سے اہم بات یہ ہے کہ دل گرفتہ والتیئر نے امید پرستی کا فلسفہ رد کر دیا جو یہ دعویٰ کرتا ہے کہ ہماری دنیا بہترین اور حسین ترین ہے اور عمدگی سے خوش انجامی کی طرف بڑھ رہی ہے۔ ہم اس ضمن میں انگریز شاعر پوپ کا حوالہ دے چکے ہیں جس کو اٹھارہویں صدی میں امید پرستی کا نمائندہ سمجھا جاتا تھا۔ والتیئر اپنی نظم میں اس کا نام لے کر سوال کرتا ہے کہ ''پوپ اگر لزبن میں ہوتا تو کیا پھر بھی وہ کہہ سکتا تھا کہ یہاں جو کچھ ہے، ٹھیک ہے؟''

''کاندید'' میں نظم کی طرح اس نظریے کو رد کیا گیا ہے۔ یہ ادبی شاہکار اس کائنات میں انسان کے مفروضہ اعلیٰ ترین مقام کا مذاق اڑاتا ہے۔ لیکن ناول میں والتیئر نے غیر متوقع مروت سے کام بھی لیا ہے۔ اس نے ناول میں پوپ کی طرف کوئی اشارہ نہیں کیا۔ اس کے بجائے وہ سترہویں صدی کے جرمن فلسفی لیبنز کو امید پرستی کے پیامبر کے طور پر پیش کرتا ہے۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ والتیئر پوپ اور دوسرے انگریز توحید پرستوں کا مداح تھا اور ان کو طنز و تضحیک کا نشانہ بنائے رکھنا پسند نہ کرتا تھا۔

یہ ایک وجہ ہے۔ دوسرا سبب یہ ہے کہ ''کاندید'' لکھنے کے دنوں میں امید پرستی کے فلسفہ کو نکتہ چینی کا ہدف بنانے کے لئے لیبنز کا انتخاب پوپ کے مقابلے میں واقعی زیادہ مناسب تھا۔ بات یہ ہے کہ لیبنز نے اس فلسفے کو زیادہ منطقی انداز میں اور زیادہ وضاحت کے ساتھ پیش کیا تھا۔

اس جرمن ریاضی دان فلسفی نے اس موضوع پر اپنے خیالات زیادہ تر ایک مختصر کتاب میں پیش کئے ہیں جس کا عنوان ''خدا کی اچھائی، انسان کی آزادی اور شر کے منبع کے موضوع پر اثبات عدل الٰہی پر ایک مقالہ'' ہے۔ اس کا دعویٰ تھا کہ اس کائنات میں جو کچھ معرض وجود میں آتا ہے وہ پہلے سے طے شدہ منصوبے اور ہم آہنگی کا نتیجہ ہوتا ہے۔ اس کا مطلب یہ ہوا کہ جو کچھ ہوتا ہے، وہ ناگزیر ہے۔ اس کے ساتھ ہی لیبنز کا دوسرا بنیادی تصور یہ ہے کہ ہماری یہ دنیا تمام امکانی دنیاؤں میں سے بہترین ہے۔ لیکن یہ نہ بھولنا چاہیئے کہ ہماری یہ دنیا تمام امکانی دنیاؤں میں سے بہترین ہونے کے باوجود قابل تصور دنیاؤں میں سے بہترین نہ ہو۔

کیوں؟ اس کا جواب یہ ہے کہ کوئی شخص بھی کسی ایسی دنیا کو تصور میں لا سکتا ہے جو

بنیادی طور پر ہماری اس حقیقی دنیا جیسی ہو، لیکن اس میں حقیقی دنیا میں پائی جانے والی کوئی ایک یا بعض بُرائیاں موجود نہ ہوں- مثال کے طور پر ایسی دنیا کا آسانی کے ساتھ تصور ذہن میں لایا جاسکتا ہے جس میں بیماری، قحط، خشک سالی، زلزلے یا جنگیں...... بلکہ خود موت...... کا وجود نہ ہو- اس میں سرے سے کوئی خرابی نہ ہو- لیکن وہ صرف قابل تصور دنیا ہوگی- آپ اس کو امکانی دنیا نہیں کہہ سکتے-

لیبنز ہم کو یہ تلقین بھی کرتا ہے کہ جس شے کو ہم بدی یا خامی کہتے ہیں وہ کائنات کے کسی حصے کو اس کی کلیت سے الگ کردینے کے سبب بدی یا خامی کے طور پر سامنے آتی ہے- جب اس کو پوری کائنات کے پس منظر میں دیکھا جاتا ہے تو وہ بدی یا خامی کے بجائے ایک عظیم الشان منصوبے کا ضروری حصہ معلوم ہوتی ہے- اس تصور کی بنیاد پر لیبنز یہ دعوی کرتا ہے کہ خدا کائنات کو حصوں میں نہیں بلکہ اس کی کلیت میں دیکھتا ہے- لہٰذا اس کے نزدیک کائنات میں کوئی بدی یا خرابی نہیں-

اس نے شر کی موجودگی کے حوالے سے ذات خداوندی کے وجود، اس کے عادل اور خیر محض ہونے کا جو یہ جواز پیش کیا، وہ اٹھارہویں صدی کے بعض مذہبی خیالات سے مطابقت رکھتا تھا- چنانچہ وہ جلد ہی اس زمانے کی یورپی فلسفیانہ رجائیت کی بنیاد بن گیا- بولنگ وڈ نے یہ خیال اڑایا اور الیگزنڈر پوپ تک پہنچایا پوپ نے اس کو اپنی نظم "انسان پر ایک مضمون" میں استعمال کیا اسی نظم سے ایک اقتباس یہاں درج کیا جاتا ہے:

All nature is but art, unknown to ;thee

All chance, direction which Thou const not see;

All discord, harmony not understood;

All partial evil, universal good;

یہ ہے وہ فلسفہ جس کو والتیئر نے کاندید میں تنقید وطنز کا ہدف بنایا ہے- یہ ناول ایک نوجوان کا قصہ ہے جس نے بہت سی دنیا دیکھی اور جو بہت سے لوگوں سے ملا- لیکن اس نے ہر جگہ یہی دیکھا کہ انسانوں کی زندگی میں کوئی اعلیٰ قدر نہیں ہے- ہر جگہ مکار حیوان ہیں- ناول میں دو بڑے کردار ہیں- ایک طرف ڈاکٹر پنگلاس ہے جو امید پرستی کے فلسفے

کی، یا یوں کہیے کہ لنبیز کی نمائندگی کرتا ہے- اس کا عقیدہ محض یہ نہیں کہ یہاں جو کچھ ہو رہا ہے، صحیح ہے- بلکہ اس کا ایمان یہ بھی ہے کہ ہماری اس بہترین دنیا میں جو کچھ ہوتا ہے، وہ بہترین ہے-

دوسرا کردار مارٹن کا ہے- وہ یاس پرستی کا نمائندہ ہے لیکن مصنف نہ تو ایک کی رجائیت کی حمایت کرتا ہے اور نہ ہی دوسرے کی یاسیت کو قبول کرتا ہے- اس کتاب کا آخری جملہ یہ ہے کہ "ہم کو اپنے باغ کی لازماً دیکھ بھال کرنی چاہیئے-" اس کا مطلب یہی ہے نا کہ دنیا نامکمل ہے- اس میں بہت سی خرابیاں ہیں- بدی ہے شر ہے-موت، جنگیں اور آفات ہیں- ظلم اور بے انصافی ہے-لیکن جہاں تک ممکن ہو، ہم کو اس کی دیکھ بھال کرنی چاہیئے اور اس کی خرابیوں کو کم کرنا چاہیئے-

کیا اس پیغام سے اختلاف ممکن ہے؟

12

یورپ کا ضمیر

مارچ1762 کے آخری دن تھے- ایک مصیبت زدہ نوجوان نے والتیئر کی حویلی کا دروازہ کھٹکھٹایا- دنیا اس کی دشمن ہوچکی تھی اور اس کا ہنستا بستا خاندان اجڑ چکا تھا- اپنے ماں باپ کی بے گناہی ثابت کرنے اور انصاف پانے کی تمنا میں وہ کئی دنوں کا سفر طے کر کے فاغنے پہنچا تھا-

اس اجنبی نوجوان کی محنت رائیگاں نہ گئی- والتیئر نے اس کو اندر بلایا- اس کے خاندان پر گزرنے والے سانحہ کی تفصیلات معلوم کیں- نوجوان اپنی بپتا سناتے ہوئے روتا تھا اور والتیئر کی آنکھوں میں بھی آنسو جھلملا رہے تھے- اس نے مصیبت زدہ نوجوان کی ہر قیمت پر مدد کرنے کا وعدہ کیا-

زندگی میں وہ بار ہا بے انصافیوں کا شکار ہوا تھا- دوسروں کو بھی اس نے ظلم کا نشانہ بنتے دیکھا تھا- مگر اب اس نے ڈٹ جانے کا ارادہ کر لیا-

مارچ کے اس دن68 سالہ والتیئر نے نیا جنم لیا-

جلد ہی وہ یورپ میں ظلم اور بے انصافی کے خلاف جہاد کی علامت بن گیا- لوگ اس کو ''براعظم کا ضمیر'' کہنے لگے- دیدرو نے شہادت دی کہ ''اگر مسیح کا کوئی وجود ہے تو مان جایئے کہ والتیئر بخشا جائی گا-''

اجنبی نوجوان کا تعلق کیلاس خاندان سے تھا جس کے مقدمے نے اس زمانے کے فرانس میں ایک طوفان اٹھا دیا تھا- ہم دو وجوہ سے اس معاملے کا قدرے تفصیل سے ذکر کرنا چاہتے ہیں- اول یہ کہ والتیئر نے اس معاملے میں غیر معمولی دلچسپی لی تھی اور بدنصیب کیلاس خاندان کو انصاف دلا کر دم لیا تھا- دوسری وجہ یہ ہے کہ کیلاس خاندان کا سانحہ اس زمانے کے فرانس کی مذہبی صورت حال کے بارے میں ہم کو بہت کچھ بتاتا ہے اور ہم کو یہ سمجھنے میں مدد ملتی ہے کہ والتیئر نے مذہب اور مذہبی نمائندوں کے خلاف شدید بغاوت کیوں کی تھی-

یہ بدنصیب ژاں کیلاس کی داستان الم ہے- وہ ایک تاجر تھا اور اپنے خاندان کے ساتھ فرانس کے قصبہ طولوس میں رہتا تھا- 13 اکتوبر 1761 کی شام کو اس نے اپنے ایک دوست کو کھانے پر مدعو کر رکھا تھا- جب وہ لوگ کھانے سے فارغ ہوئے تو اچانک شور برپا ہوا- ژاں کیلاس کو معلوم ہوا کہ اس کے جواں سال بیٹے مارک انطونی نے خودکشی کر لی ہے- اس کی لاش ایک کمرے میں رسی سے لٹک رہی تھی- غم زدہ باپ نے رسی کاٹ کر بیٹے کی لاش اتاری- مصیبت کی اس گھڑی اس نے اپنے دوسرے بیٹے کو ہدایت کی کہ خاندان کی عزت کی خاطر وہ کسی کو نہ بتائے کہ اس کے بھائی نے خودکشی کی ہے-

تھوڑی دیر بعد پولیس آ گئی- گھر کے سامنے لوگوں کا ہجوم جمع ہو چکا تھا- ہر کوئی نوجوان کی غیر متوقع موت پر قیاس آرائی کر رہا تھا- بھیڑ میں سے اچانک آواز ابھری کہ مارک انطونی کو اس کے خاندان نے قتل کیا ہے کیونکہ وہ آبائی پروٹسٹنٹ مذہب چھوڑ کر کیتھولک ہو گیا تھا-

فرانس کی آبادی کا بڑا حصہ کیتھولک تھا- اس فرقے کے پادریوں کی بالادستی قائم تھی- چنانچہ اس گمنام آواز کو سب سے بڑی شہادت مانا گیا- ژاں کیلاس اور اس کے بیوی بچوں کو قتل کے الزام میں گرفتار کر لیا گیا- لوگ مارک انطونی کو "سچے مذہب کا شہید" قرار دینے لگے- اس کو کیتھولک رسوم کے مطابق سپرد خاک کر دیا گیا-

کیلاس خاندان پر طولوس کی اعلیٰ عدالت میں مقدمہ چلایا گیا- عدالت نے باپ کو موت کی سزا سنائی اور باقی لوگوں کو جلاوطن کر دیا گیا- اس سزا پر عمل مارچ 1762 کے اوائل میں ہوا جب لوہے کی ایک سلاخ سے ژاں کیلاس کی تمام پسلیاں توڑ دی گئیں اور شدید

اذیتیں دے کر موت کی نیند، سلا دیا گیا- بدنصیب باپ نے حوصلہ مندی سے سزا برداشت کی- آخری لمحے تک وہ اپنی بے گناہی پر قائم رہا-

یہ ایک عجیب وغریب مقدمہ تھا جس میں ججوں نے ملزموں کا موقف سننے سے زیادہ مذہبی جنونیوں کے نعروں کو پیش نظر رکھا- پورے فرانس میں اس مقدمہ کی دھوم ہوئی- کیتھولک فرقے کی بالادستی کے باعث سب کو یہی بتایا جارہا تھا کہ پروٹسٹنٹ باپ نے عقیدہ بدلنے پر بیٹے کو قتل کردیا ہے- والتیئر تک بھی اسی مفہوم کی اطلاعات پہنچی تھیں- اس نے کبھی اتنا ہولناک واقعہ نہ سنا تھا جو اس کے اپنے المیہ ڈراموں سے بھی زیادہ رنج دینے والا تھا- اس نے سوچا ہوگا کہ مذہبی جنون واقعی کس قدر ہولناک ہوتا ہے-

ژاں کیلاس کے دو بیٹے پولیس کی قید سے آزاد ہونے کے بعد بھاگ گئے تھے- وہ ان میں سے ایک تھا جس نے والتیئر سے ملاقات کی اور اس کو اپنے خاندان کی داستان غم سنائی- دوسرے فریق کا موقف سننے کے بعد والتیئر کو یقین ہوگیا کہ مارک انطونی کو اس کے گھر والوں نے قتل نہیں کیا تھا اور یہ کہ وہ کیتھولک بھی نہیں ہوا تھا- اصل میں وہ وکیل بننا چاہتا تھا اور اس زمانے کے فرانس میں اس کام کے لئے کیتھولک ہونا ضروری تھا- لٰہذا وکالت میں گہری دلچسپی کے باعث مارک انطونی نے ایک مرتبہ کیتھولک ہونے کے فائدے کا ذکر کیا تھا- بس اتنی سی بات کا مذہبی جنونیوں نے فسانہ بنا ڈالا تھا-

اچھا تو اگر مارک انطونی کو قتل نہیں کیا گیا تھا تو اس کا مطلب ہے کہ اس نے خودکشی کی تھی- مگر کیوں؟ اس کا جواب یہ تھا کہ جب وہ وکیل نہ بن سکا تو مایوسی کے عالم میں اس نے اپنی جان لے لی تھی-

حقائق کا علم ہونے پر والتیئر کو کیلاس خاندان کی بے گناہی کا یقین آ گیا- وہ ژاں کیلاس کو دوبارہ زندگی نہیں دلوا سکتا تھا- لیکن اس کے عدالتی قتل کی خلاف احتجاج کرسکتا تھا، اس کی بے گناہی کے حق میں فیصلہ لے سکتا تھا اور بدقسمت خاندان کی بحالی میں مددگار ثابت ہوسکتا تھا- اس نے یہ سب کچھ کیا- بااثر دوستوں سے مدد لی، اپنے روپے پیسے قلم، زبان اور اثر ورسوخ کے ذریعے وہ طولوس کی عدالت کے ان سات ججوں کے خلاف صف آرا ہوگیا جنھوں نے مذہبی جنون کے زیر اثر حقائق پر غور کئے بغیر ایک بے گناہ باپ کو بیٹے کے قتل کے جرم میں موت کی سزا دی تھی- اس نے ایک دفاعی کمیٹی بنائی- فرانس کے ایک

بڑے وکیل کی خدمات حاصل کیں اور جب تک مقدمہ نہ جیتا، سکھ کا سانس نہ لیا- اس نے کیلاس کی بیوہ کی طرف سے پیرس کی اعلیٰ عدالت میں اپیل کی درخواست بھی دائر کی- تین سال کی مسلسل اور انتھک کوششیں آخر رنگ لائیں اور اعلیٰ عدالت نے1765 میں آنجہانی ژاں کیلاس کو بے گناہ قرار دے دیا اور اعتراف کیا کہ طولوس کے سات ججوں نے ''قانون کی خلاف ورزی کرتے ہوئے اس کو مجرم ٹھہرایا تھا- کیلاس خاندان کی بے گناہی ثابت ہونے پر پورے فرانس میں لوگوں نے خوشی منائی-

بعض سخت دل تذکرہ نگار کہتے ہیں کہ والتیئر نے محض شہرت کی خاطر اس مقدمے میں گہری دلچسپی لی تھی- مگر یہ ایک ایسا الزام ہے جو دوسروں کے کام آنے والے تمام لوگوں پر آسانی سے لگایا جاسکتا ہے- کیا ہم میں سے کوئی ایدھی صاحب کو یہ الزام نہیں دے سکتا؟ خیر، والتیئر کے معاملے میں واقعات کا غیر جانب داری سے جائزہ لیا جائے تو اس الزام کی تائید نہیں ہوتی- جو لوگ اس کے قریب تھے، اس کے دوست تھے اور اس کو اچھی طرح جانتے تھے، ان میں سے ایک کا کہنا ہے کہ وہ دوسروں کے مصائب پر یوں دل گرفتہ ہوجاتا تھا جیسے وہ اس کی اپنے مصائب ہوں-

اس وضاحت کے باوجود حقیقت یہ ہے کہ کیلاس خاندان کے لئے چلائی جانے والی مہم نے والتیئر کو اس کی نظموں، ڈراموں، ناولوں اور دوسری کتابوں سے بڑھ کر شہرت عطا کی اور وہ دیکھتے ہی دیکھتے اپنے ملک کا سب سے مشہور آدمی بن گیا- ہر کوئی اس کی حق پرستی اور جرات مندی کے گیت گانے لگا تھا-

بہرطور ہم آگے بڑھتے ہیں اور یہ کہنا چاہتے ہیں کہ بعض مورخین نے کیلاس خاندان کا معاملہ یوں پیش کیا ہے جیسے وہ اپنی نوعیت کو منفرد واقعہ ہو- حقیقت اس کے برعکس ہے- اس زمانے کے فرانس میں ہی نہیں بلکہ دنیا کے اکثر حصوں میں مذہبی جنون کی شدت کے باعث اس قسم کے واقعات پیش آتے رہتے تھے- پاکستان میں یہ جنون اب تک قائم ہے اور ہم اس کے نتیجے میں رونما ہونے والے ہولناک واقعات کے عادی ہو چکے ہیں- بہرحال خود والتیئر کے حوالے سے ہلاکت آفرین مذہبی جنون کے دو اور واقعات ہم یہاں درج کرتے ہیں جن سے اس زمانے کی صورت حال کو اچھی طرح سمجھنے میں مدد ملے گی-

کیلاس خاندان کے ہولناک المیے کے کچھ ہی عرصہ بعد جنوب مغربی فرانس میں ایسا

ہی ایک اور المیہ رونما ہوا- اس علاقے کے ایک ماں باپ پر مذہبی تعصب کی بنا پر اپنی بیٹی کو قتل کرنے کا الزام لگایا گیا اور موت کی سزا دی گئی-

اس واقعہ کی تفصیل یہ ہے کہ الیزبتھ سرون ایک مخبوط الحواس لڑکی تھی- ایک دفعہ وہ گھر سے غائب ہوگئی- چند روز بعد پروٹسٹنٹ فرقہ سے تعلق رکھنے والے اس کے باپ کو شہر کے کیتھولک سربراہ کے محل میں طلب کیا گیا اور بتایا گیا کہ اس کی بیٹی نے پناہ مانگی ہے اور یہ کہ اس کو کیتھولک راہباؤں کے سپرد کر دیا گیا ہے- باپ کو یقین تھا کہ بڑے پادری صاحب جھوٹ بول رہے ہیں اور یہ کہ اس کی بیٹی کو زبردستی اغوا کر کے کیتھولک بنایا جا رہا ہے- مگر وہ ڈر کے مارے چپ رہا اور بیٹی واپس لینے کی کوشش نہ کی-

دوسری طرف الیزبتھ کی ذہنی حالت بگڑتی جا رہی تھی- یہاں تک کہ وہ بالکل ہوش وحواس کھو بیٹھی- چنانچہ سات ماہ کے بعد پادری صاحبان نے اس کو گھر پہنچا دیا- مگر وہ زیادہ عرصہ گھر نہ رہی- جنون کے عالم میں ایک بار پھر بھاگ گئی- چند روز بعد اس کی لاش ایک کنویں سے ملی- آسانی سے یقین کیا جاسکتا تھا کہ وہ بدنصیب لڑکی پاگل پن کی حالت میں کنویں میں جا گری ہوگی- تاہم شہر کے کلیسائی حکام نے الزبتھ کے خاندان پر اس کے قتل کا الزام لگا دیا- سرون، اس کی اہلیہ اور دو بیٹوں کو گرفتار کرنے کا حکم جاری ہوا- لیکن وہ لوگ سیانے ثابت ہوئے اور بھاگ نکلے- ان کی غیر حاضری میں مقدمہ چلایا گیا- ماں باپ دونوں کو موت کی سزا سنائی گئی- الیزبتھ کی دونوں بہنوں کو بھی معاف نہ کیا گیا- ان کے لئے یہ حکم دیا گیا کہ وہ والدین کو پادریوں کے ہاتھوں اذیت سے مرتے ہوئے دیکھیں-

بھاگا ہوا خاندان فاغنے آیا- انہوں نے والتیئر کو بپتا سنائی- کیلاس معاملے کی طرح والتیئر نے اس کیس میں بھی گہری دلچسپی کی- اس نے مظلوم خاندان کے لئے فنڈز جمع کئے- ان کے حق میں اپنے قلم سے کام لیا- قانونی چارہ جوئی کی اور آخر کار خاندان کی بے گناہی کو ثابت کر دیا-

اس قسم کے واقعات کا سلسلہ ختم ہونے والا نہ تھا- وہ وقوع پذیر ہوتے ہی رہتے تھے- ظاہر ہے کہ تاریخ نے ان سب کو محفوظ نہیں کیا- خدا ہی جانتا ہے کہ کتنے بے گناہ لوگ اہل کلیسا کے جنون کی بھینٹ چڑھ گئے ہوں گے-

انہی دنوں والتیئر نے ایک اور واقعہ کے بارے میں سنا- اس واقعہ کا تعلق شولر بارے

سے تھا جس پر توہین مذہب کا الزام لگایا گیا اور وحشیانہ تشدد کے بعد اس کا سر قلم کر دیا گیا۔

نارمنڈی کے نواح میں اپنے ول نامی ایک چھوٹے سے گاؤں کے اس نوجوان کی بدنصیبی اس وقت شروع ہوئی جب گاؤں کے پل پر نصب لکڑی کی صلیب ایک صبح ٹوٹی ہوئی پائی گئی۔ صلیب کے ٹوٹنے سے آبادی میں اضطراب پھیل گیا۔ ضعیف الاعتقاد لوگ مختلف قصے گھڑنے لگے۔

اس واقعہ کے کئی ہفتے بعد گاؤں میں گرجا کی مقدس نشانیوں کا جلوس نکالا گیا۔ لوگ نشانیوں کو دیکھتے اور سر جھکا کر کھڑے ہو جاتے۔ مگر وہ یہ دیکھ کر حیران ہو گئے کہ تین نوجوان نے سر نہیں جھکایا۔ وہ نشے میں تھے اور گیت گا رہے تھے۔ انہوں نے مقدس نشانیوں کا احترام نہ کیا تھا۔

جنونیوں کو فوراً صلیب کی بے حرمتی یاد آ گئی۔ انہوں نے دونوں واقعات کا جوڑ دیا اور تینوں نوجوانوں کو گرفتار کر لیا۔ ان پر مقدس اشیا کی بے حرمتی کا الزام لگایا گیا۔ باقی دو میں سے ایک پادریوں کے ساتھ مل گیا۔ اس نے اپنے دوست کے خلاف گواہی دی اور جان بچالی۔ یہ تیسرا شولر بارے تھا۔ اس پر ایک الزام یہ بھی تھا کہ وہ والتیئر کی کتاب ''فلسفیانہ لغت'' پڑھتا ہے۔ عدالت نے اس کو موت کی سزا دے دی۔

بھاگنے والا ملزم فریڈرک اعظم کی فوج میں بھرتی ہو گیا تھا۔ والتیئر کو معلوم ہوا تو اس نے بلا بھیجا۔ اس سے سارا قصہ سنا اور جب ان نوجوانوں کی بے گناہی کا یقین آیا تو والتیئر نے اس عدالتی قتل کے خلاف قلمی جہاد کیا۔

والتیئر کا بجا طور پر کہنا تھا کہ اس قسم کے ہولناک واقعات فرانس کے تمام حصوں میں رونما ہوتے ہیں۔ لوگ چند لمحوں کے لئے ان پر تشویش ظاہر کرتے ہیں اور پھر کھانے کی میز کی طرف دوڑ پڑتے ہیں۔ مگر وہ خود ان لوگوں میں شامل نہ ہوا۔ ہم نے اس باب میں جو تین واقعات بیان کئے ہیں، ان میں سے دو کردار والتیئر تک اطلاع پہنچنے سے پہلے ہی ہلاک کئے جا چکے تھے۔ مگر والتیئر نے ان کی معصومیت ثابت کرنے کے لئے کوئی کسر نہ چھوڑی۔ وہ کہتا تھا کہ مستقبل میں ایسے واقعات کی روک تھام کے لئے جدوجہد کرنا ضروری ہے۔

ان واقعات کی حوالے سے والتیئر نے کئی پمفلٹ لکھے۔ ''رواداری پر مقالہ'' انہی ایام کی یادگار ہے۔ والتیئر نے اس پمفلٹ میں لکھا تھا کہ ہر شخص کو وہ عقیدہ رکھنے اور اس کا اظہار کرنے کا حق حاصل ہے جس کو وہ درست سمجھتا ہے۔ شرط بس میں یہ ہے کہ وہ امن

عامہ میں خلل کا باعث نہ بنے۔عقیدے کا حق بنیادی حق ہے۔لیکن ہمارے آج کے سماج کی طرح اٹھارہویں صدی کے فرانس میں اس حق کو منوانا آسان نہ تھا۔

13

مذہب

والتیئر کے زمانے کے فرانس میں پائی جانے والی مذہبی بنیاد پرستی اور اس سے پیدا ہونے الے انسانی مصائب کی جھلکیاں ہم دیکھ چکے ہیں- اس کے اپنے مذہبی خیالات بڑی حد تک ایسی صورت حال کا ردعمل تھے- تو آیئے اس باب میں ہم اس کے مذہبی افکار پر ایک نظر ڈالیں-

اس معاملے میں تعجب انگیز بات یہ ہے کہ سینکڑوں تحریریں لکھنے والے والتیئر نے اپنی کسی کتاب یا پمفلٹ میں اپنے مذہبی خیالات منظّم طور پر پیش نہیں کیئے- وہ اس کی کتابوں، پمفلٹوں، نظموں، ڈراموں اور قصے کہانیوں کے ساتھ ساتھ درجنوں خطوط میں بکھرے پڑے ہیں- ان کو یکجا کرنا بہت مشکل ہے اور منظّم صورت میں پیش کرنے کو امر محال ہی سمجھنا چاہیئے-

مذہبی فکر کے حوالے سے والتیئر کی متعلق کوئی بات یقین کے ساتھ کہی جاسکتی ہے تو وہ یہ ہے کہ وہ توحیدی(DEIST) تھا- مگر یہ ایک ایسا نظریہ ہے کہ جس پر ایمان رکھنے والوں کے نظریات ایک دوسری سے بہت مختلف قسم کے ہیں- سچی بات یہ ہے کہ خود اس فلسفے کو ابھی تک کسی نے بھی منطقی طور پر واضح اور مربوط صورت میں پیش نہیں کیا ہے- مختلف فلسفی کئی قسم کے مختلف مفاہیم میں اس کی تشریح وتوجیہ کرتے ہیں- بہرحال ہم اس امر کی

وضاحت کر دیں کہ اگرچہ بعض مسلم صوفیوں اور انیسویں صدی کے بعض ہندوستانی مسلم دانش وروں، مثلاً سرسید احمد خان اور مولوی چراغ علی کے ہاں بھی DEISM سے ملتے جلتے تصورات ملتے ہیں لیکن یہاں ہم کو ان سے کوئی سروکار نہیں ہے۔ بلکہ ہم اس مذہبی تحریک کی طرف اشارہ کر رہے ہیں جو یورپ میں زیادہ تر سترہویں اور اٹھارہویں صدیوں میں نمایاں ہوئی تھی۔

اس تحریک کے خیالات کا خلاصہ یوں بیان کیا جاسکتا ہے کہ ذات باری تعالی کا اظہار وحی کے بجائے فطری عقل کے ذریعے ہوتا ہے اور فطری عقل کے وسیلے ہی سے انسان خدا تک رسائی پاسکتا ہے۔ انسان اور خد کے درمیان تعلق براہ راست ہوتا ہے۔ خالق اور مخلوق کے درمیان رابطے کے لئے کسی اور وسیلے کی ضرورت نہیں ہے۔ اس تحریک کا بڑا مرکز انگلستان تھا اور انگلستانی تحریک مسیحی کلیسا اور اس کی منحرفین کے درمیان طویل مذہبی بحث ومباحثہ اور جھگڑوں کا ردعمل تھی۔ ساتھ ہی ساتھ جدید سائنس کی نشوونما نے بھی اس تحریک کو پھلنے پھولنے میں مدد دی تھی۔ توحید پرست روشن خیالی کے اصولوں کا اطلاق مذہب پر کرنے کی امید رکھتے تھے۔ ان کا خیال تھا کہ خدا کے عمل کا اظہار اس کی تخلیق کردہ کائنات سے ہوتا ہے۔ اور یہ کہ خدا فطرت کے قوانین کے مطابق عمل کرتا ہے۔ اس حوالہ سے وہ روایتی مذاہب کے مقابلے میں ایک فطری مذہب مرتب کرنے کی کوشش کرتے تھے اور مافوق الفطرت معموں کے سخت خلاف تھے۔ آپس میں اختلافات کی باوجود وہ اس بات پر متفق تھے کہ خدا تمام اشیا کا خالق ہے اور وہی تمام انسانوں کے بارے میں فیصلہ کرے گا۔ تاہم وہ انسانی امور میں خدا کی مداخلت کے منکر تھے۔ لہٰذا دعاؤں، عبادتوں اور معجزوں پر ایمان نہیں رکھتے تھے۔

والتیئر کے مذہبی خیالات کی عمدہ وضاحت رینے پومیو نے اپنی کتاب ''والتیئر کا مذہب'' میں کی ہے۔ پومیو صاحب نے اس کتاب میں والتیئر کے بارے میں عمومی معلومات کے علاوہ مذہب اور بنیادی مذہبی مسائل پر اس کے خیالات کے بارے میں بہت سی قابل قدر تفصیلات پیش کر دی ہیں۔ تاہم انہوں نے ثابت یہی کیا ہے کہ والتیئر توحیدی تھا۔ اس کے معاصرین بھی یہی بات کہا کرتے تھے۔ ایک اور مصنف نارمن ٹورے نے اپنی کتاب ''والتیئر اور انگلستان توحیدی'' میں بھی یہی رائے دی ہے۔ البتہ اس نے یہ اضافہ کیا ہے کہ

وہ ایک تنقیدی توحیدی تھا۔

مذہبی امور کے بارے میں والتیئر کے خیالات جاننے کے لئے خود اس کی جو تحریر سب سے زیادہ مددگار ثابت ہوسکتی ہے وہ اس کا ایک طویل مضمون ہے جس کا عنوان اس نے ''مابعد الطبیعیات پر ایک مقالہ'' رکھا تھا۔ اس نے یہ مقالہ مادام ایمیلی کے ساتھ میل ملاپ شروع ہونے کے بعد لکھا تھا اور عام طور پر سمجھا جاتا ہے کہ یہ مقالہ مادام کی فرمائش پر لکھا گیا تھا۔ والتیئر نے اپنی زندگی میں اس کو شائع نہیں کروایا تھا۔ شاید وہ اس کی اشاعت کو خطرناک سمجھتا تھا۔ مقالے میں اس نے بنیادی سوال یہ اٹھایا ہے کہ کیا خدا وجود رکھتا ہے؟ اگر خدا وجود رکھتا ہے تو انسان کے ساتھ اس کے تعلق کی نوعیت کیا ہے؟

یہاں ہم یہ بتا دیں کہ ''مابعد الطبیعیات پر ایک مقالہ'' ایک پُرفریب عنوان ہے۔ وہ ہم کو اشارہ دیتا ہے کہ اس مقالے میں انسان کے بنیادی سوالات پر عالمانہ انداز میں بحث ملے گی اور مصنف نے منطقی طریقہ کار کے مطابق نتائج اخذ کئے ہوں گے۔ لیکن مقالے میں ایسی کوئی بات نہیں ہے۔ والتیئر نے یہ مقالہ بھی اپنے مخصوص ہلکے پھلکے اور طنزیہ انداز میں تحریر کیا ہے۔ لہٰذا ہم کو یاد رکھنا چاہیئے کہ وہ فلسفیانہ اور تجریدی سوالات اٹھاتا تو ہے لیکن فلسفیوں جیسے انداز میں ان کے جواب نہیں دیتا۔ وہ فلسفیوں کی زبان اور اصطلاحوں سے بھی گریز کرتا ہے۔ میرا خیال ہے کہ گریز کے بجائے یوں کہنا چاہیئے کہ وہ ان اصطلاحوں سے بھاگتا ہے۔ ساٹھ سال پر مشتمل تصنیف وتالیف کی زندگی میں اس کا یہی چلن رہا۔ فلسفیوں کے نظام اس کو ایک آنکھ نہ بھاتے تھے۔ وہ ان کو سراسر حماقت سمجھتا تھا۔ ایک جگہ اس نے بالکل صاف طور پر اس کا اعتراف ان الفاظ میں کیا ہے کہ ''منظّم قسم کے فلسفیانہ نظام میری عقل کو ٹھیس پہنچاتے ہیں اور اس کی توہین کرتے ہیں۔''

والتیئر کی ایک نمایاں خوبی یہ ہے کہ وہ کوئی ایسا جملہ نہیں لکھتا جو پڑھتے ہی سمجھ میں نہ آجائے۔ آپ کو یہ بتانے کی ضرورت نہیں ہے کہ پیشہ ور قسم کے فلسفی اس قسم کی تحریر کو عامیانہ خیال کرتے ہیں اور ''عامیانہ تحریر'' سے ان کی مراد مفہوم اور وقار سے محروم تحریر ہوتی ہے۔ وہ ایسی تحریروں کے شوقین ہوتے ہیں جو الفاظ کا گورکھ دھندہ ہوں اور آسانی سے سمجھ میں نہ آتی ہوں۔ جرمن فلسفی ہیگل اس قسم کے فلسفیوں کی عمدہ مثال ہے اور اس کا کہنا یہ تھا کہ ''میرا فلسفہ صرف میرا ایک شاگرد، روزن کرانز، سمجھا ہے اور وہ بھی غلط ہی سمجھا ہے۔''

ہیگل اور اس جیسے فلسفیوں کے مقابلے میں والتیئر کے متعلق ہم کو یہ کہنا چاہیئے کہ اس کا اسلوب فلسفیوں جیسا نہیں بلکہ باب سائنس جیسا ہے۔

بہرطور ہم جب والتیئر کے زیر بحث مقالے کا محتاط مطالعہ کرتے ہیں تو اس بارے میں کوئی شبہ نہیں رہتا کہ وہ خدا پر ایمان رکھتا تھا۔ سچ تو یہ ہے کہ وہ ایک قدم اور آگے جانے کو تیار تھا اور سمجھتا تھا کہ اگر خدا کا وجود نہ ہوتب بھی انسانوں کو راہ رست پر رکھنے، زندگی کو بامعنی بنانے اور امید کو قائم رکھنے کی خاطر خدا کو وجود میں لانا پڑے گا۔ چنانچہ مابعد الطبیعیات پر اپنے مقالے میں وہ لکھتا ہے کہ ''اس رائے کو قبول کرنے میں کئی مشکلات پیش آتی ہیں کہ خدا وجود رکھتا ہے۔ لیکن بات یہ ہے کہ اس کی ضد (خدا کے عدم وجود پر یقین) سے کئی نامعقول اور واہیات نتائج پیدا ہوجاتے ہیں۔'' فریڈرک کے نام ایک خط میں اس نے لکھا تھا کہ خدا کا وجود ممکن ہے، مگر اس کا کوئی حتمی ثبوت موجود نہیں۔ تاہم اس کا ہونا، اس کے نہ ہونے سے بہتر ہے۔ ''فلسفیانہ لغت'' میں اس نے لکھا تھا کہ ''خدا کی موجودگی ہم انسانوں کے مفاد میں ہے۔ اس کا وجود انصاف کا سبب بن سکتا ہے۔'' یہ خط اس نے 1737 میں لکھا تھا۔ اس کے کئی سال بعد 1770 میں اس نے لکھا تھا کہ خدا کے وجود کے عقیدے کو برقرار رکھنا چاہیئے۔ انسانی معاشرے کو اس کی ضرورت ہے۔'' یہاں وہ ایک بار پھر اپنا قول دہراتا ہے کہ ''اگر خدا موجود نہیں تو پھر اس کو بنانا پڑے گا۔''

والتیئر کی اس بات سے، تھوڑی سی لچک سے کام لیتے ہوئے، ہم یہ تو مان لیتے ہیں کہ وہ خدا کو مانتا تھا، لیکن ساتھ ہی ہم کو زیادہ احتیاط سے کام لیتے ہوئے اس امر کا اضافہ بھی کرلینا چاہیئے کہ وہ اپنے اس یقین کو محض فلسفیانہ یا ذہنی قسم کی ایک سہولت سمجھتا تھا۔ یوں اس کا اعتقاد اصل میں الحاد سے بس ایک چھوٹا سا قدم ہی پیچھے ہے۔ اس کی وفات کے لگ بھگ ڈیڑھ سو سال بعد مروج ہونیوالی امریکی اصطلاح استعمال کرتے ہوئے ہم کہہ سکتے ہیں کہ خدا پر اس کا یقین نتائجیت پسندانہ (Pragmatic) تھا۔ وہ خدا کو اس لئے مانتا تھا کہ اس سے مفید نتائج پیدا ہوتے ہیں۔

یہ تو ہم پہلے ہی کہہ چکے ہیں کہ والتیئر فلسفیوں کے طور طریقوں سے دور رہتا تھا۔ چنانچہ اس نے منطقی طریقے سے خدا کا وجود ثابت کرنے کی کوئی کوشش نہیں کی۔ ایسی کوئی کوشش اس کے نزدیک بے معنی ہوتی ہے۔ اس کی ڈراموں میں سے ایک کا نام ''سقراط''

ہے- ڈرامے کے مرکزی کردار یعنی سقراط کے منہ میں اس نے یہ الفاظ ڈالے ہیں جو غالباً اس کے اپنے نقطہ نظر کی وضاحت کرتے ہیں...... ''خدا تو بس ایک ہی ہے، لامحدود ہونا اس کی فطرت ہے- کوئی اور ذات اس کی لامتناہیت میں شریک نہیں ہوسکتی- آفاق پر نگاہ ڈالو- دھرتی اور سمندروں کو دیکھو ہر شے میں موافقت ہے- ہر شے ایک ہی منصوبے کا حصہ ہے- لہٰذا (اس کائنات) کا ایک ہی بنانے والا ہے- ایک ہی مالک ہے- ایک ہی نگہبان ہے-''

چلیے مان لیا کہ کائنات کا خالق، مالک اور نگہبان ایک ہی ہے- مگر والتیئر اس کے ساتھ کوئی ربط محسوس نہیں کرتا اور نہ ہی کوئی پختہ قسم کا ایمان اس کے وجود پر رکھتا ہے- خدا، والتیئر کی نزدیک، سہولت اور فائدے بہم پہنچانے والا وجود ہی رہتا ہے- اس قسم کا عقلی خدا بس ایک تجریدی سا اصول ہوتا ہے- اس کو مذہب، یعنی روایتی مذہب، کے جیتے جاگتے اور کائنات پر مطلق العنانی سے حکومت کرنے والے خدا سے کوئی نسبت نہیں ہوتی- انسانوں کے ساتھ اس کا ٹھوس تعلق نہیں ہوتا- لہٰذا ایسے خدا پر ایمان رکھنے والے وحی یا خدا کی طرف سے نازل ہونے والی کتابوں پر ایمان نہیں رکھتے اور وہ روایتی مذہبی اداروں کو استحصالی ادارے خیال کرتے ہیں اور عموماً ان کے خلاف برسر پیکار رہتے ہیں-

والتیئر کے ہاں ہم کو یہ ساری باتیں ملتی ہیں- خدا کی ماہیت کے بارے میں ہم کو بتانے کے لئے اس کے پاس زیادہ کچھ نہیں ہے- ہم دیکھ چکے ہیں کہ وہ عمر بھر مسیحی مذہبی رسوم اور اسطور کا مذاق اڑاتا رہا اور ان کے خلاف جنگ بھی کرتا رہا تھا- اس نے یہ جنگ بستر مرگ تک جاری رکھی- چنانچہ اس کے آخری وقت کے بارے میں ایک قصہ یہ ہے کہ ایک پادری صاحب اس کی نجات کی دعا مانگنے چلے آئے- والتیئر نے ان کی تشریف آوری کا سبب پوچھا تو انہوں نے جواب دیا:

''میں پادری ہوں- مجھے خدا نے بھیجا ہے-''

''بہت خوب'' والتیئر نے کہا- ''مگر آپ کا تقرر نامہ کہاں ہے؟''

ایک جگہ وہ لکھتا ہے کہ مذہبی لوگ ہم کو بتایا کرتے ہیں کہ فلاں فلاں وقت پر خدا زمین پر نازل ہوا- اس نے کسی خاص قصبے میں درس دیا- وہ لوگوں سے مخاطب ہوا- لیکن لوگوں نے اس کی باتیں نہ سنیں- اپنے کان بند کر لئے- اس قسم کے سینکڑوں قصے ہیں- اب دنیا کو

ان بے سروپا قصوں پر ہنسنا چاہیئے۔"اب تک جتنے خدا بھی ایجاد کیئے گئے ہیں، میں ان کے بارے میں بس یہی کہوں گا۔ میں ہندوستان کے عفریتوں کے ساتھ مصر کے عفریتوں سے زیادہ رحم دلی کے ساتھ پیش نہیں آؤں گا۔ میں ہر اس قوم کو موردِ الزام ٹھہراؤں گا جس نے ایک عالمگیر خدا کو نجی دیوتاؤں کے متعلق ان توہمات کی خاطر چھوڑ دیا ہے۔"

وہ ہم کو یقین دلاتا ہے کہ یہ بات سنجیدگی سے قبول کرنے کے بجائے محض مضحکہ خیز ہی سمجھنی چاہیئے کہ ایک قادر مطلق خدا نے، جو پوری کائنات کا رب ہے، خانہ بدوشوں کے ایک چھوٹے سے قبیلے، یعنی یہودیوں کو اپنی منتخب قوم قرار دے رکھا ہے۔ وہ یہودیوں کی مقدس کتاب کو ناقابل یقین واقعات، ناشائستہ امور اور تضادات سے بھرپور قرار دیتا ہے۔ عہد نامہ جدید کے بارے میں اس کی رائے صرف تھوڑی سی مختلف ہے۔ وہ اس کو گنوار اور معمولی لوگوں کی غیر اہم باتوں کا مجموعہ قرار دیتا ہے۔

زندگی کے آخری برسوں میں چرچ اور مسیحیت کے خلاف اس کے احساسات اور جذبات میں مزید شدت پیدا ہوتی چلی گئی تھی۔ سیدھی سی بات ہے کہ ارباب کلیسا کے طرز عمل نے ان کے لیئے کسی ہمدردی کی گنجائش نہ چھوڑی تھی۔ انسانوں کو غلام بنانے اور ان پر ظلم وستم کے پہاڑ توڑنے کے ان کے عمل نے ان کی اخلاقی برتری کا تصور بھی ختم کر دیا تھا یوں اس زمانے کے بے شمار سوچنے سمجھنے والے لوگوں کی طرح والتیئر نے بھی مان لیا تھا کہ آزادی اور انصاف کے لئے، جبر و تشدد اور استحصال کے خاتمے کے لئے چرچ سے نجات ضروری ہے۔ ایک جگہ وہ یہ کہنے کی حد تک چلا گیا تھا کہ" میں یہ سن سن کر تنگ آ گیا ہوں کہ مسیحیت کو رائج کرنے کے لئے صرف بارہ افراد کافی ثابت ہوئے تھے۔ میں یہ ثابت کرنا چاہتا ہوں کہ اس کو تباہ کرنے کیلیئے صرف ایک ہی شخص کافی ہے۔"

فاغنے میں قیام کے دوران اس نے جو بے شمار خطوط لکھے ان میں سے کئی خطوط کا اختتام اس تلقین پر ہوا ہے کہ" ہم کو برائی کو جڑ سے اکھاڑ پھینکنا چاہیئے"۔ والتیئر کی زندگی، اس کی جدوجہد اور اس کی تحریروں کی سرسری سوجھ بوجھ رکھنے والوں کو بھی یہ جاننے میں دشواری پیش نہیں آتی کہ اس "برائی" سے اس کی مراد کیا تھی۔ صاف طور پر اس سے مراد منظّم کلیسا اور توہم پرستی ہیں۔ اس نے ان کے ہاتھوں ستم اٹھائے تھے اور معصوم لوگوں کو ان کے خونی ہاتھوں سے تباہ ہوتے دیکھا تھا، لہٰذا موقع ملتے ہی وہ ان پر حملہ آور ہو جاتا تھا۔

اس کو یقین تھا کہ مذہبی بنیاد پرستی تعصب، تشدد اور تنگ نظری کے خاتمے کے بغیر اچھے
انسان اور اچھا سماج پیدا نہیں ہوسکتا۔

14

فلسفیانہ ڈکشنری

فاغنے میں قیام کے دوران جب والتیئر مذہبی تنگ نظری، تشدد اور ظلم وستم کے خلاف عملی جنگ لڑ رہا تھا تو اس نے نئے محاذ کھولنے کے باوجود تصنیف وتالیف کے کام کو نظر انداز نہیں کیا- اس نے اپنا کام جاری رکھا اور بعض ایسے تحریری منصوبے بھی مکمل کئے جن کا خیال اس کو کئی برس پہلے آیا تھا مگر وہ ان پر کام جاری نہ رکھ سکا تھا-

ان منصوبوں میں ایک اہم کام ''فلسفیانہ ڈکشنری'' کی تالیف تھا- والتیئر کو پہلے پہل اس کام کا خیال بادشاہ فریڈرک کی ایک دعوت کے دوران آیا تھا- ہم گمان کر سکتے ہیں کہ اس کو یہ تصور کس قدر پُرکشش معلوم ہوا ہوگا- وہ ہر شے کے بارے میں جاننے کا مشتاق رہتا تھا اور ہر شے کی بارے میں گفتگو کرنے میں لطف لیتا تھا...... تو پھر کیوں نہ ایسی کتاب مرتب کی جائے جس میں بہت سے موضوعات پر وہ اپنے خیالات مختصر انداز میں قلمبند کردے؟ فلسفہ کی ڈکشنری کا اس کے پاس یہی تصور تھا- جلد ہی اس نے جوش وخروش سے کام شروع کر دیا- پھر رکاوٹیں پیدا ہوگئیں- کام رک گیا- فاغنے میں اس کو یہ رکا ہوا کام یاد آیا- وہ دوبارہ اس پر توجہ دینے لگا-

یہ کام 1764 میں مکمل ہوا اور اسی سال ''جیبی ڈکشنری'' کے عنوان سے کتابی صورت میں شائع ہوگیا- وہ اس کو اپنے ہم وطنوں کے لئے نظریاتی کتاب سمجھتا تھا- اس کا خیال تھا

کہ غور وفکر کی اہلیت رکھنے والے تمام فرانسیسیوں کو اس کا مطالعہ کرنا چاہیئے- یہ کتاب ہاتھوں ہاتھ لی گئی- اگلے سال جب اس کا نیا ایڈیشن شائع ہوا تو کتاب کا عنوان بدل دیا گیا- اب اس کو ''فلسفیانہ ڈکشنری'' کا نام دیا گیا- یہ وہ زمانہ نہیں تھا کہ اس قسم کی کتابوں کا نوٹس نہ لیا جائے اور نہ ہی والتیئر ایسی کتابیں لکھتا تھا کہ جن سے حکام اپنی آنکھیں بند رکھ سکیں- یہ کتاب شائع ہوئی تو فوراً ہی ضبط کر لی گئی اور اس کو نذر آتش کر دیا گیا-

اس کتاب کے متعلق جو باتیں ہم کو جاننی چاہئیں ان میں سے ایک یہ ہے کہ اس پر والتیئر کا نام درج نہ تھا- بات یہ ہے کہ احتساب کے خوف کی بنا پر وہ کئی تحریروں پر اپنا نام نہیں دیا کرتا تھا- پھر بھی لوگ جان جاتے تھے کہ یہ والتیئر کا ہی کام ہے- کبھی کبھی تو وہ پوچھے جانے پر صاف مکر جاتا تھا اور اپنی تحریر کو قبول نہیں کرتا تھا-

''فلسفیانہ ڈکشنری'' کے معاملے میں یہی ہوا- یہ کتاب احتساب کی زد میں آئی- ضبط ہوئی اور جلائی گئی تو ساتھ ہی ساتھ یہ چرچا بھی ہونے لگا کہ یہ والتیئر کی کتاب ہے اور اس نے اپنے تمام اہم خیالات اس میں درج کر دیئے ہیں- ان حالات میں اس نے قسم کھا کر ڈی المبرٹ سے کہا تھا کہ '' یہ چھوٹی سی قابل نفرت کتاب میری نہیں ہے- مجھے تو یہ کسی شیطان کا کام لگتا ہے-'' بعد ازاں اس نے ڈی المبرٹ کو ایک خط میں تلقین کی تھی کہ وہ لوگوں کو یقین دلائے کہ اس '' قابل نفرت کتاب'' کا والتیئر سے کوئی تعلق نہیں ہے-

خیر، قصہ یہ ہے کہ بے انصافی اور ظلم پر بنیاد رکھنے والے فرانسیسی سماج کے ان تمام افراد نے اس کتاب کی مذمت کی جن کو اس سماج میں اعلیٰ مقام حاصل تھا اور ان تمام افراد نے اس کو پڑھا جو پڑھ سکتے تھے- یوں اس کتاب نے ایک ہلچل سی پیدا کر دی- والتیئر کو پہلے سے اس کی توقع تھی- چنانچہ احتساب سے بچنے کے لیئے اس نے اپنا نام درج نہ کرنے اور اس کا مصنف ہونے سے انکار کرنے کے علاوہ دیباچے میں یہ بھی لکھا تھا کہ '' اس کتاب کو صرف تعلیم یافتہ لوگ ہی پڑھ سکتے ہیں اور وہ ہیں ہی کتنے- یورپ کے کسی گاؤں میں مشکل سے دو ایسے افراد ملتے ہیں جو پڑھنا جانتے ہوں- یہ عام لوگوں کے لئے کتاب نہیں ہے- وہ اس کو سمجھ نہ پائیں گے-''

احتساب سے بچنے کے لئے اس نے ایک اور قدم اٹھایا اور دوسرے ایڈیشن کے دیباچے میں لکھا کہ اس کتاب کے اکثر حصے دوسرے مصنفین کی کتب سے لئے گئے ہیں-

لیکن کتاب کے متن میں اس نے صاف اعلان کیا کہ "یہ کتاب دوسروں کی کہی ہوئی باتوں کو دہرانے کے لئے نہیں لکھی گئی ہے۔" سچ بھی یہی ہے۔ والتیئر نے دوسروں کی باتیں دہرائی ہیں اور نہ ہی نقل کی ہیں۔ بلکہ اس نے فلسفہ، مذہب، الٰہیات، تاریخ، سائنس، لسانیات، موسیقی، شاعری، ڈرامہ اور بعض دیگر موضوعات پر اپنے خیالات پیش کئے ہیں۔

والتیئر اس ڈکشنری کو اس انسائیکلو پیڈیا کا ضمیمہ سمجھتا تھا جو پیرس میں چند آزاد خیال عالم اور دانش ور مل کر لکھ رہے تھے۔ چنانچہ اس نے بعض مقامات پر ان کے کام کی تعریف کی ہے اور ان کے حوالے بھی دیئے ہیں۔ ایک جگہ اس نے لکھا ہے کہ اسکندریہ کی لائبریری میں طبیعیات کے موضوع موجود تمام ادب کے مقابلے میں انسائیکلو پیڈیا کے صرف دو صفحات زیادہ سچائی رکھتے ہیں۔

اگر ہم ڈکشنری کے متعلق یہ کہیں کہ اس میں انسائیکلو پیڈیا کی روح کو شامل کر دیا گیا ہے اور اس کے فنی عناصر خارج کر کے عام تعلیم یافتہ لوگوں کو فائدہ پہنچانے والی کتاب بنا دیا گیا ہے تو یہ بات غلط نہ ہوگی۔ اصل میں والتیئر کا بنیادی طریقہ کار یہی تھا۔ وہ سب کچھ عام لوگوں کے لئے لکھتا تھا۔ بہرحال اس نے انسائیکلو پیڈیا پر کئی جگہ تنقید اور اعتراض بھی کئے ہیں۔ علاوہ ازیں اس نے اکثر جگہ بائبل یا یوں کہیے کہ اہل کلیسا کے نقطہ نظر کی تردید کی ہے اور ان کی غلطیوں کو نمایاں کیا ہے۔

بے شک اس کتاب کا عنوان "فلسفیانہ ڈکشنری" ہے۔ لیکن اگر ہم اس کو آج کے زمانے میں مرتب کی جانے والی مختلف علوم وفنون کی لغات جیسا سمجھ لیں تو پھر ہم غلطی پر ہوں گے۔ اس کو فلسفے کی لغت قرار دینا تو واقعی دور کی کوڑی لانے والی بات ہے۔ آج کی زبان میں ہم کو یوں کہنا چاہیئے کہ یہ بہت سے موضوعات پر مختصر مضامین اور خیالات کا مجموعہ ہے۔ ان کو پیش کرتے ہوئے ابجدی ترتیب مدنظر رکھی گئی ہے۔ مگر کہیں کہیں اس کو نظر انداز بھی کر دیا گیا ہے۔ اس میں یورپ کا روایتی فلسفہ نہیں ملتا۔ اور اس فلسفہ کو تلاش کرنے کی کوشش فضول سی ہوگی جو مثال کے طور پر، فکری نظام مرتب کرنے والے فرانسیسی یا جرمن فلسفیوں کا محبوب رہا ہے۔

اصل بات یہ ہے کہ والتیئر نے جہاں کہیں "فلسفہ" کی اصطلاح استعمال کی ہے تو اس سے مراد وہ مفہوم لیا ہے جس کو ہم "روشن خیالی" یا "عقل پرستی" کا عنوان دیتے ہیں۔ جس

شے کو یورپی پس منظر میں عام طور پر ''فلسفہ'' کا نام دیا جاتا ہے، والتیئر اس کو عموماً ''مابعد الطبیعیات'' کہا کرتا تھا اور جس کو ہم ''مابعد الطبیعیات'' کہتے ہیں وہ (شاید بجا طور پر) اس کو بکواس سمجھتا تھا۔

اگر ہم اس موضوع پر بحث میں دلچسپی لینا شروع کر دیں کہ والتیئر کا رویہ یورپ کے روایتی فلسفیوں سے مختلف کیوں تھا تو یہ مختصر تعارفی کتاب اس کی متحمل نہ ہو سکے گی۔ لہٰذا اس سے دامن بچاتے ہوئے ہم یہ کہنا چاہیں گے کہ والتیئر نے اپنی اس قاموس میں بہت سے موضوعات پر اپنے خیالات پیش کر دیئے ہیں اور وہ اٹھارہویں صدی کے اس جینیس کو سمجھنے کا عمدہ وسیلہ بن گئی ہے۔

اس کتاب کی اشاعت کے بعد والتیئر کی دو اور مختصر کتابیں ''انسائیکلو پیڈیا سے متعلق سوالات'' اور ''ابجدی آرا'' کے عنوانات سے شائع ہوئی تھیں۔ اس کی وفات کے بعد ان دونوں کتاب کو بھی ڈکشنری میں شامل کر دیا گیا تھا۔ مزید براں بعض ایسے مضامین بھی اس کا حصہ بنا دیئے گئے جو والتیئر کے مسودوں سے ملے۔ یوں ڈکشنری پھیل کر تین جلدوں کی صورت اختیار کر گئی۔

اس قسم کی کتاب طوفان خیز کیونکر ثابت ہوئی؟ اس سوال کا جواب یہ ہے کہ والتیئر نے اس کتاب میں شامل مضامین آگ لگانے کے لئے ہی لکھے تھے۔ وہ خود اس کو انقلابی قرار دیتا تھا اور جب اس نے کہا تھا کہ یہ کتاب کسی شیطان کا کارنامہ ہے تو اصل میں اس کی مراد یہی تھی کہ یہ کتاب سیاسی اور مذہبی حکمرانوں اور روایتی طرز کے عالموں فاضلوں کے لئے صدمے کا باعث بنے گی۔ یہ ایک خطرناک کام تھا جو والتیئر نے احتیاطی تدابیر کے باوجود پوری جرات کے ساتھ کیا۔ بے شک وہ اپنی تدبیروں کے باعث خود بچ گیا، لیکن کتاب نذر آتش ہوئی اور جیسا کہ ہم نے دیکھا شولر دی بارے کو اذیت ناک موت تک لے جانے والے عوامل میں سے ایک ثابت ہوئی۔

1764 میں شائع ہونے والے ڈکشنری کے پہلے ایڈیشن میں الحاد، ملحد، تقریر کی آزادی، رواداری، روح، انسانی فہم کی حدود، تعصب، حسن، جسم، حماقت، نقد وتنقید، محبت، جنت، حضرت موسیٰ، حضرت سلیمان، حضرت ابراہیم، بت، بت پرستی اور آمریت جیسے موضوعات شامل تھے۔ گویا مصنف نے ایسے موضوعات منتخب کئے تھے جن کو فلسفہ اور الہیات کے وسیع

تر دائرے میں شامل کیا جا سکتا ہے۔

والتیئر کو زیادہ دلچسپی سچائی کا تعین کرنے میں تھی۔ مثلاً وہ تاریخ یا مذہب کا کوئی واقعہ چن لیتا ہے اور پھر پہلا سوال یہ کرتا ہے کہ آیا یہ واقعہ واقعی رونما ہوا تھا۔ اس نے بائبل میں بیان ہونے والے کئی واقعات کے متعلق یہ سوال اٹھایا ہے اور جو جواب اس نے دیئے ہیں وہ ارباب کلیسا کے لئے قابل برداشت نہ تھے اور ان کے روایتی موقف کو شدید ضعف پہنچاتے تھے۔ اس نے ایسے کئی واقعات کو جھٹلا دیا جن پر مسیحیت کی بنیاد دستوار تھی۔

ارباب کلیسا کے لئے یہ حملہ سخت تھا۔ مگر اس زمانے میں عقل پرستی، روشن خیالی اور سائنس کی طرف سے بھی شدید حملے شروع ہو چکے تھے۔ ان سے عاجز آ کر مذہب والوں نے یہ جان لیا تھا کہ وہ اپنی مقدس کتب کی عبارتوں کے لغوی مفاہیم کا دفاع نہیں کر سکتے۔ انہوں نے بچاؤ کی ہر ممکن کوشش کی۔ مگر آخر کار انہوں نے اس تصور میں پناہ ڈھونڈی کہ جو واقعات مذہبی کتب میں درج ہیں، ان کا لغوی طور پر درست ہونا ضروری نہیں۔ ان کی نوعیت علامتی ہے۔ یہ نقطہ نظر انیسویں اور بیسویں صدیوں میں مقبول ہوا اور اب دنیا میں کم وبیش سبھی مذاہب سے تعلق رکھنے والے دانش وروں نے یہ موقف اختیار کر لیا ہے کہ مذہبی واقعات و بیانات کو ان کے لغوی کے بجائے علامتی مفہوم میں قبول کرنا چاہیئے۔ اس طرح انہوں نے اپنی مقدس کتابوں کو سائنس اور روشن خیالی کے حملوں سے بچا لیا ہے وجہ یہ ہے کہ جب ان کا مفہوم ہی طے شدہ نہیں ہے تو پھر آپ ان کو کسی طور غلط یا بے معنی ثابت نہیں کر سکتے۔

والتیئر کے زمانے کا ماحول مختلف تھا۔ اس کے زمانے میں لوگ اس قدر مذہبی اور سادہ دل تھے کہ وہ مقدس صحیفوں سے لفظی مفہوم مراد لیتے تھے اور سمجھتے تھے کہ ان کے لفظی معنی لازمی طور پر درست ہیں۔ اس امر کو ان صحیفوں کی توہین کے مترادف سمجھا جاتا تھا کہ ان کے کسی حصے کے لغوی مفہوم پر ایمان رکھا جائے اور کسی حصے کو علامتی مان کر معنی اخذ کئے جائیں۔ اس زمانے کے آزاد خیال دانش وروں نے پہلا وار لغوی مفہوم پر کیا تھا اور والتیئر دانش وروں میں پیش پیش تھا۔

خیر، والتیئر کو صرو بائبل اور دوسری مذہبی اسطور میں بیان ہونے والے واقعات کی تاریخی قدر و قیمت میں ہی دلچسپی نہ تھی۔ وہ یہ بھی دیکھنا چاہتا تھا کہ ان کی اخلاقی قدر و قیمت

کیا ہے۔ کیا وہ انسانوں کو اچھائی کی طرف مائل کرتے ہیں یا دوسری طرف لے جاتے ہیں۔
"فلسفیانہ ڈکشنری" میں اس کی تگ ودو زیادہ تر انہی دو معاملات تک محدود رہی تھی۔ نتیجہ یہ
ہوا کہ ڈکشنری نے سوچنے سمجھنے والے لوگوں کو بہت زیادہ متاثر کیا اور ان رجحانات کو فروغ
دیا جو آخر کار 1789ء کے انقلاب فرانس کی طرف لے گئے۔

15

موت کا سایہ

''فلسفیانہ ڈکشنری'' کی ذیلی کتب کی اشاعت کا سلسلہ 1772 تک جاری رہا تھا- تب والتیئر 78 برس کا ہو چکا تھا- لیکن اس کے ولولے کمزور نہیں پڑے تھے- اس کے پاس کہنے کو بہت کچھ تھا- انسانی تاریخ میں کم ہی ایسے افراد گزرے ہیں جنھوں نے اتنا زیادہ لکھا ہو اور جو 80 سال کی عمر کے لگ بھگ پہنچ کر بھی تصنیف وتالیف کا کام جاری رکھنے پر تلے ہوں- جیسا کہ اس کتاب کے پہلے باب میں ہم نے پڑھا، وہ ''نیم مردہ'' حالت میں پیدا ہوا تھا اور اس کی صحت زندگی میں کبھی قابل رشک نہ رہی تھی- مگر اس نے صحت کی خرابیوں کو اپنے کام پر حاوی نہ ہونے دیا- وہ اب بھی ان کو دبائے ہوئے تھا-

کئی اعتبار سے یہ اس کی زندگی کے بہترین سال تھے- برسوں کی جدوجہد کے بعد وہ براعظم یورپ کا ممتاز ترین شہری بن گیا تھا- کہہ لیجئے کہ وہ فرد نہ رہا، ایک علامت بن گیا...... آزادی، انصاف، عقل اور روشن خیالی کی علامت- فرانس کے عوام اس کے گن گاتے تھے اور براعظم کے بادشاہ بھی اس کی عظمت سے منکر نہ تھے- پیرس میں جب اس کے دوستوں اور مداحوں نے اس کا شاندار مجسمہ بنوانا چاہا تو یورپ کے چار بادشاہوں نے چندے دیئے- ان میں روس، جرمنی، پولینڈ اور ڈنمارک کی بادشاہ شامل تھے-

جرمنی کا بادشاہ فریڈرک اب فریڈرک اعظم بن چکا تھا- اس نے والتیئر کے ساتھ

ہونے والے جھگڑے بھلا دیئے تھے اور ایک بار پھر اس بزرگ دانا کا دوست بن گیا تھا۔ والتیئر نے بھی تلخ ماضی کو سینے سے لگائے نہ رکھا۔ فریڈرک کے ہاتھوں اس کو سب سے زیادہ ذلت اور پریشانی فرینک فرٹ میں اٹھانا پڑی تھی۔ وہ اگرچہ فریڈرک کا شہر نہ تھا لیکن اس کے زیر اثر تھا۔ اس شہر میں والتیئر اور اس کی بھانجی کو گرفتار کر لیا گیا تھا۔ بیتے ہوئے ایام کے اس ناگوار واقعہ کا ذکر کرتے ہوئے والتیئر نے اب اس کو" محبت کرنے والے دوست کی لڑائی" سے تعبیر کیا اس دوست کے ساتھ خط و کتابت دوبارہ شروع ہوگئی۔ روس کی ملکہ کیتھرئین کے ساتھ بھی رابطے رہتے تھے۔ والتیئر کو اپنی براعظمی حیثیت کا بھرپور احساس تھا۔ وہ خود کو اس قدر اہم سمجھنے لگا تھا کہ جب بادشاہ جوزف ثانی فاغنے سے کچھ فاصلے پر جینوا سے گزرا اور والتیئر سے ملنے نہ آیا تو اس کو سخت توہین کا احساس ہوا۔

فاغنے کی حویلی میں مہمانوں کی بھیڑ رہتی۔ یورپ کے تمام حصوں سے ادیب، فن کار، شاعر، فلسفی، شہزادے، جرنیل اور سفارت کار والتیئر کو خراج تحسین پیش کرنے اور اس سے ملنے، اس سے ہم کلامی کا اعزاز حاصل کرنے آتے تھے۔مگر وہ اپنا وقت ضائع نہیں کرنا چاہتا تھا۔ اس کو معلوم تھا کہ وقت کم رہ گیا ہے اور بہت کچھ کرنے کی تمنا جوں کی توں ہے۔ چنانچہ مختلف حیلوں بہانوں اور خصوصاً صحت کی خرابی کی آڑ میں وہ ان میں سے اکثر سے نجات پالیتا تھا۔ یہ محض بہانہ بھی نہ تھا۔ اس کی صحت واقعی جواب دیتی جارہی تھی۔ فاغنے میں ایک ملاقاتی نے اس کو دیکھا تو کہہ اٹھا" آہ یہ والتیئر ...... لگتا ہے کہ خود کو دفن کرنا بھول گیا ہے۔"

موت کی طرف اس کے قدم بڑھ رہے تھے۔ وہ کہا کرتا تھا کہ" زندگی ایک بچے کی مانند ہے جس کو نیند آنے تک جھولا دینا ضروری ہے۔" جھولے وہ دے رہا تھا۔ اس عالم میں یہ خیال اس کے دل میں ضرور آتا ہوگا کہ اس نے براعظم کو فتح کرلیا ہے۔ اپنے ہم وطنوں کے دل بھی موہ لئے ہیں۔لیکن فرانس کا بادشاہ اور اعلیٰ حکام اب بھی اس کے مخالف تھے۔ دارالحکومت پیرس جہاں وہ پیدا ہوا تھا اور جہاں اس نے تعلیم حاصل کی تھی اور جہاں اس کے بہت سے دوست، ساتھی، چاہنے والے اور پرانی یادیں تھیں...... وہ ابھی تک اس کے لئے ممنوعہ شہر تھا۔ پندرہویں لوئی بادشاہ نے اس شہر میں اس کے داخلہ پر پابندی لگائی تھی۔ وہ اگلے جہان سدھار چکا تھا۔سولہویں لوئی نے اس کی جگہ لے لی تھی۔ سب کچھ بدل

گیا تھا۔ لیکن رسمی طور پر پابندی ختم نہ ہوئی تھی۔

پیرس سے نکلے اس کو سالہا سال بیت گئے تھے۔ یہ دوست اس کو وہاں بلا رہے تھے۔ ان کا اصرار تھا کہ چند دنوں کے لئے ہی آ جاؤ۔ شہر کے آزاد خیال دانش ور، فلسفی، نوجوان ادیب اور فن کار بھی اس کو بلاتے تھے۔ عالموں کا انسائیکلو پیڈیا گروپ بھی اس کی واپسی کا آرزومند تھا۔ پیرس جانے کے لئے سب سے زیادہ اصرار مادام ڈینس کی طرف سے تھا۔ اور مادام کی بات وہ ٹال نہ سکتا تھا۔

دوستوں اور مداحوں کا اصرار کہیے یا یادوں کے ہجوم کا دباؤ کہ 83 سال کی عمر میں والتیئر نے چند روز کے لئے پیرس جانے کا ارادہ کر لیا۔ اس زمانے میں یہ مشکل کام تھا۔ فاغنے سے پیرس جانے کے لئے چار پانچ دن کا کٹھن سفر طے کرنا پڑتا تھا۔ مگر وہ جو طے کر لیتا، کر گزرتا تھا۔

1778 کا فروری کا مہینہ شروع ہوا۔ اس مہینے کے پہلے ہفتے میں مادام ڈینس فاغنے سے نکلی اور پیرس روانہ ہوئی۔ اس کے جانے کے دو روز بعد والتیئر نے بھی رخت سفر باندھا۔ اس سفر کے زیادہ حالات معلوم نہیں ہیں۔ البتہ جو قصے مشہور ہیں، ان میں سے ایک یہ ہے کہ جب وہ پیرس کے نواح میں پہنچا تو کسٹم والوں نے روک لیا۔

انہوں نے پوچھا:

''آپ کے پاس کوئی ایسی چیز تو نہیں جس کو بادشاہ سلامت نے ممنوع قرار دے رکھا ہو؟''

''میرے پاس'' والتیئر بولا: ''میرے سوا کوئی ممنوعہ شے نہیں ہے۔''

جلد ہی دارالحکومت میں اس کی واپسی کی دھوم مچ گئی۔ پورا شہر اس کے استقبال کے لئے اُمڈ آیا۔ بادشاہ سلامت، بڑے پادری اور عظیم الشان امرا کا وہ شہر جہاں سے اس کو باہر نکالا گیا تھا، اب اس کی راہ میں بچھا جا رہا تھا۔ شہر میں میلے کا سماں تھا۔ لوگ مذہب کی زنجیریں توڑ کر انسانوں کو رہائی دلانے کے لئے عمر بھر جدوجہد کرنے والے بوڑھے فلسفی کی ایک جھلک دیکھنے کیلئے اپنے سارے کام کاج چھوڑ کر آ گئے تھے۔ بچے اور عورتیں بھی اس کی آمد پر خوشیاں منا رہی تھیں۔ شاید وہ خود بھی نہ جانتا تھا کہ لوگ اس کو کس قدر چاہتے ہیں۔ برٹرنیڈ رسل نے خوب ہی کہا ہے کہ ''دنیا سچائی کی طرف بلانے والوں کی مخالفت کرتی ہے۔

مگر آخر کار ان کے آگے جھک جاتی ہے۔"

پیرس میں آمد کے بعد والتیئر نے فاغنے جیسے معمولات جاری رکھنا چاہے۔ مگر صحت ساتھ نہ دے رہی تھی۔ وہ لوگوں سے مل نہیں رہا تھا۔ شہر میں افواہیں گردش کرنے لگیں کہ وہ بستر مرگ پر ہے اور چند لمحوں کا مہمان ہے۔ اٹھارہویں صدی کی کئی اور ممتاز شخصیات کی طرح اس کی موت کی خبریں بھی مرنے سے پہلے شائع ہوگئیں۔

والتیئر 10 فروری 1778 کو پیرس پہنچا تھا۔ اس سے صرف چار دن پہلے پیرس میں امریکہ کے سفیر بنجمن فرینکلن نے کئی مہینوں کی تگ ودو کے بعد آخر کار فرانس کے حکمرانوں کو امریکہ کی جنگ آزادی میں باقاعدہ مدد دینے پر آمادہ کر لیا تھا۔ فرینکلن 1776 کے امریکی اعلان آزادی کی تشکیل میں سرگرم کردار ادا کرنے کے فوراً بعد پیرس آیا تھا اور اب اپنی کامیابی کا جشن منا رہا تھا، جب اس کو والتیئر کی آمد کی اطلاع ملی تو فوراً ملنے کے لئے آ گیا۔ یہ ان دونوں کی پہلی ملاقات تھی۔ دونوں کے بہت سے خیالات یکساں تھے۔ دونوں رواداری اور انصاف کا درس دینے والے تھے۔ فرینکلن ملنے آیا تو اپنے آٹھ سالہ پوتے کو ساتھ لایا جو اس کا ہم نام بھی تھا۔ اس نے پوتے کے لئے کہن سالہ فلسفی سے آشیر باد کی درخواست کی۔ والتیئر نے ننھے فرینکلن کے سر پر ہاتھ رکھ کر" خدا اور آزادی" کی دعا دی۔ اس نے کہا کہ فرینکلن کے پوتے کے لئے بس یہی دعا ہوسکتی ہے۔

بنجمن فرینکلن کے رخصت ہونے کے ٹھیک ایک گھنٹہ بعد ایک اور مہمان آیا۔ وہ لارڈ سٹور مونٹ تھا۔ برطانیہ کا سفیر۔ وہ فرینکلن کا ذاتی اور سیاسی مخالف تھا۔ فرینکلن سے والتیئر کی دوسری اور آخر ملاقات چندروز بعد پیرس میں اکیڈمی آف سائنسز کے ایک کھلے اجلاس میں ہوئی تب امریکی سفیر کے ساتھ جان ایڈمز بھی تھا جو چند سال بعد امریکہ کا صدر بننے والا تھا۔ وہ ان دنوں ایک سفارتی مشن پر پیرس آیا ہوا تھا۔ اس نے بڑے شوق سے اس ملاقات کا حال لکھا ہے۔

20 فروری 1778 کو والتیئر کو راہب گالیٹر کا ایک خط موصول ہوا۔ اس نے پادری کے طور پر اس فلسفی کی آخری رسومات کے لئے اپنی خدمات پیش کی تھیں۔ اہل کلیسا کے ساتھ عمر بھر کے جھگڑوں کے بعد اب والتیئر کو خیال آ رہا ہوگا کہ اگر اس نے کلیسائی حکام میں سے کسی کے ساتھ اچھے تعلقات نہ بنائے تو پھر مرنے کے بعد اس کے جسم کی بے حرمتی ہوسکتی

ہے- یقیناً اس کو اداکارہ ایدرین لیکوورور کا واقعہ نہ بھولا ہوگا- چنانچہ اس نے حیل وحجت کے بغیر راہب کی پیش کش قبول کر لی- تاہم چرچ کی آخری رسوم کا حق دار بننے کی خاطر ایمان کا اعلان ضروری تھا- والتیئر جیسے شخص کی طرف سے تو یہ اعلان اور بھی ضروری تھا جو پورے یورپ میں پادریوں اور مذہب کے دشمن کے طور پر مشہور تھا- چنانچہ فروری کے آخری روز والتیئر نے اس سلسلے میں ایک مختصر بیان لکھوایا- اس نے کہا تھا کہ ''میں خدا کی تعظیم کرتے ہوئے، اپنے دوستوں سے محبت اور دشمنوں سے نفرت نہ کرتے ہوئے اور توہم پرستی کی مذمت کرتے ہوئے اس دنیا کو خیر باد کہہ رہا ہوں-''

بھلا اتنے سے بیان سے اہل کلیسائی تسلی کیونکر ہونی تھی- وہ زبانیں تیز کرنے لگے- علاقے کا پادری بھی بگڑ گیا- اس کا کہنا تھا کہ والتیئر اس کے علاقے میں رہتا ہے اور راہب گالٹر کو اس کے معاملے میں ٹانگ اڑانے کا کوئی حق نہیں ہے-

مرنے کی تیاری کرنے والا والتیئر جان گیا کہ معاملہ ہاتھ سے نکل سکتا ہے- چنانچہ 2 مارچ کو اس نے ایک نیا بیان تیار کروایا جس میں اس نے کہا کہ وہ کیتھولک مذہب کی راہ پر چلتے ہوئے اس دنیا سے رخصت ہو رہا ہے- وہ اس مذہب میں پیدا ہوا تھا اور اسی کے حوالہ سے وہ خدا سے نجات کا طلب گار ہے-

اس بیان کے چند روز بعد تک اس کی صحت بہتر رہی- پھر موت کا دن...... 30 مئی 1778...... آ گیا- موت سے چند گھنٹے پہلے علاقے کا پادری راہب گالٹر کے اس کے پاس آیا- اس نے پوچھا:

''جناب آپ مسیح کی الوہیت پر ایمان رکھتے ہیں؟''

والتیئر نے جواب دیا

''حضرت، مجھے سکون سے مرنے دیجئے!''

16

جائزہ

ہم والتیئر کی زندگی اور اس کی اہم تصانیف پر ایک نظر ڈال چکے ہیں- یہ ایک تعارفی مطالعہ تھا- یقینی طور پر اس مختصر کتاب میں ایسے کئی واقعات، تفصیلات اور خیالات کو جگہ نہیں مل سکی ہے جو اس موضوع پر کسی ضخیم کتاب میں نظر انداز نہیں کئے جاسکتے- آپ نے یہ بھی محسوس کیا ہوگا کہ اس کتاب میں والتیئر کے سوانح حیات پر زیادہ توجہ دی گئی ہے- یہ بات بالکل ناگزیر تھی- اصل بات یہ ہے کہ اس کی زندگی ہی اس کا سب سے بڑا کام تھی- ایک اور وجہ بھی ہے- اور وہ یہ کہ والتیئر بہت زیادہ لکھنے والا مصنف تھا- اس کی تمام تحریروں کا احاطہ کسی ضخیم کتاب میں بھی مشکل ہی سے کیا جاسکتا ہے- خیر، ہمارا مقصد بھی یہ نہ تھا کہ اس کی تحریروں کی فہرست بنائی جانے اور ان سب کا تعارف لکھا جائے- اس کتاب کے لکھنے کے دوران یہ مقصد پیش نظر رہا کہ والتیئر کا ایک ایسا تعارف پیش کیا جائے جس میں اس کی زندگی اور اس کے کام دونوں کے بارے میں بنیادی معلومات شامل ہوں-

والتیئر کی نگادشات کی تعداد ہی حیران کن ہے- سکالرز نے92 ضخیم جلدوں میں اس کی تصانیف جمع کر کے شائع کی ہیں- مگر اس کی تحریریں صرف ان جلدوں تک محدود نہیں- تھیوڈور بیسٹر مین نے103 موٹی جلدوں میں والتیئر کے بیس ہزار سے زیادہ خطوط شائع کئے ہیں- مختلف اوقات پر سترہ سو سے زیادہ افراد کو لکھے جانے والے یہ خطوط محبوباؤں سے پوپ

اور عام کسانوں سے لے کر علماو فضلا تک کے نام ہیں۔

یہ خطوط محض ذاتی نوعیت کے نہیں ہیں۔ بلکہ ان میں روشن خیالی کے فلسفے کے بنیادی موضوعات اور رویوں کی وضاحتوں کے ساتھ ساتھ سیاسی اور مذہبی حوالوں سے برسر اقتدار گروہوں کے خلاف جدوجہد ان کے ہتھکنڈوں اور تدبیروں پر بحثیں کی گئی ہیں۔ علاوہ ازیں والتیئر اپنے عہد کے اہم واقعات اور افراد کو بھی زیر بحث لایا ہے۔ یوں ہم دیکھتے ہیں کہ اس کا سارا تحریری کام دوسو کے لگ بھگ جلدوں میں سمیٹا گیا ہے۔ یہ جلدیں ڈیڑھ کروڑ سے زیادہ الفاظ پر مشتمل ہیں۔ اس تعداد کی عظمت کا اندازہ آپ اس امر سے لگا سکتے ہیں کہ اردو کی کسی کتاب کے ایک صفحے پر عموماً پانچ سو سے زیادہ الفاظ نہیں ہوتے ۔ اچھا اگر ہم اس تعداد کو معیار مان لیں تو اس کا مطلب یہ ہوا کہ والتیئر نے زندگی میں تین لاکھ کے قریب صفحات لکھے!

بے شک انسانی تاریخ کے چند ہی اور مصنفین نے زندگی میں اتنا زیادہ لکھا ہوگا۔ یہی نہیں، بلکہ وہ ایک خوش نصیب مصنف بھی تھا۔ چند ہی مصنف تاریخ میں ایسے ہوں گے جن کی تحریریں والتیئر کی نگارشات جیسی متاثر کن ثابت ہوئی ہوں گی۔

والتیئر کے اثرورسوخ کا اندازہ اس کے معاصرین کی شہادت سے بھی لگایا جاسکتا ہے۔ چنانچہ اس کی وفات کے پانچ سات سال بعد، فرانس کے انقلاب سے پہلے، کنڈورسٹ نے لکھا تھا کہ:

> ''یورپ میں عقل اور انسانیت کے نام پر آنے والی تبدیلیوں کی تاریخ اصل میں والتیئر کی تحریروں اور اس کی فیض رسانی کی تاریخ ہے۔ اگر شہروں کی چاردیواری بلکہ عبادت گاہوں کے اندر بھی مردوں کو دفن کرنے کی بے ہودہ اور خطرناک رسم کو بعض ملکوں میں ترک کردیا گیا ہے، اگر یورپ کے براعظم کے بعض حصوں میں انسان ٹیکے کے ذریعے ایسی آفتوں سے محفوظ ہونے لگے ہیں جو اکثر اوقات ان کی زندگی تباہ کردیتی تھیں، اگر رومن کیتھولک مذہب کے زیر اثر ملکوں کے کلیسائی عہدے دار اپنے خطرناک اختیارات سے محروم ہوگئے ہیں اور وہ اپنی شرمناک دولت سے محروم ہوگئے ہیں، اگر پریس کی آزادی نے کچھ پیش رفت کی ہے، اگر سویڈن، روس، پولینڈ،

پروشیا اور آسٹریا کی مملکتوں میں آمرانہ عدم رواداری کا چلن نہیں رہا۔ اگر فرانس اور اٹلی کی بعض ریاستوں میں بھی اس کو ختم کرنے کے لئے جرات کی گئی ہے، اگر روس، ڈنمارک، بوہیمیا اور فرانس میں جاگیردارنہ غلامی کی باقیات کو ضعف پہنچا ہے، اگر آج پولینڈ بھی اس غلامی کی بے انصافی اور اس کا خطرہ محسوس کرنے لگا ہے، اگر تقریباً سبھی اقوام کے بے ہودہ اور وحشیانہ قوانین ختم کردیئے گئے ہیں یا ختم ہونے کے خدشے سے دوچار ہیں، اگر ہر جگہ قانون اور عدالتوں کی اصلاح کی ضرورت محسوس کی جارہی ہے، اگر براعظم یورپ میں لوگوں کو یہ احساس ہوگیا ہے کہ وہ اپنی عقل کو استعمال کرنے کا حق رکھتے ہیں، اگر سماج کے بالائی طبقوں میں مذہبی تعصب ختم ہوگیا ہے اور عام لوگوں میں اس کا زور پہلے سا نہیں رہا ہے، اگر ان تعصّبات کے علمبردار اپنی سیاسی افادیت قائم رکھنے کی شرم ناک ضرورت تک محدود ہو کر رہ گئے ہیں، اگر انسانیت کی محبت تمام حکومتوں کی مشترکہ زبان بن گئی ہے، اگر جنگیں پہلے سے کم ہوگئی ہیں، اگر اب کوئی شخص بھی بادشاہوں کے تکبر یا دعوؤں کو پیش کرنے کی جرات نہیں کرتا جن کو وقت جنگ کے حیلوں بہانوں کے طور پر رد کرچکا ہے، اگر ہم ان تمام فریب کاریوں کا زوال دیکھ چکے ہیں جن کے پردے میں مراعات یافتہ طبقے بنی نوع انسان کو فریب دیا کرتے تھے، اگر پہلی بار عقل یورپ کی اقوام پر ایک خالص اور مستحکم روشنی ڈالنے لگی ہے...... تو پھر آپ کو ہر جگہ ان تبدیلیوں کی تاریخ میں والتیئر کا نام ملے گا۔ ہر جگہ وہ آپ کو جنگ شروع کرتا یا فتح کا تعین کرتا دکھائی دے گا۔''

ہوسکتا ہے کہ یہ اقتباس آپ کو مبالغہ آرائی کا تاثر دے۔ لیکن اس بارے میں کوئی شبہ نہیں ہے کہ والتیئر بے حد متاثر کرنے والا مصنف ثابت ہوا - زمانے نے اس کے ساتھ سلوک بھی دیوتاؤں جیسا کیا۔ اس کی وفات کے دس گیارہ سال بعد جب فرانس میں تاریخ ساز انقلاب رونما ہوا، تو بورژوا خاندان میں جنم لینے اور اشرافیہ جیسے رہن سہن کے دلدارہ والتیئر کو انقلاب کے عظیم الشان بانیوں میں شامل کرلیا گیا۔ ہمارے پاس یہ یقین کرنے کی

وجوہ موجود ہیں کہ اگر یہی انقلاب اس کی زندگی کے دوران میں برپا ہوتا تو وہ شاید اس کی حمایت نہ کرتا- سیاسی اعتبار سے وہ بہرطور قدامت پسند تھا اور شاہ پرست بھی- مگر اس کا یہ مطلب نہیں ہے کہ فرانسیسی انقلاب میں اس کا کوئی کردار نہ تھا- چرچ کی بالادستی کو چیلنج کر کے نیز سیاسی جبر و تشدد اور بے انصافی کے خاتمے کے لئے اٹھارہویں صدی کے نہ صرف فرانس بلکہ پورے یورپ میں سب سے موثر آواز بلند کر کے والتیئر نے انقلاب کی راہ ہموار کرنے میں بلاشبہ ناقابل تردید کردار ادا کیا تھا-

انقلاب کے لئے کام کرنے والے اور بھی تھے- ان میں سے دیدرو اور مونٹسکو کے نام معروف ہیں- مگر ان سب میں سے زیادہ چرچا والتیئر اور روسو کا ہی ہوتا ہے، والتیئر کا نمایاں پہلو یہ ہے کہ اس نے ریاست اور کلیسا کے درمیان ہونے والی طویل کشمکش میں کلیسا کے مخالفوں کی رہنمائی کی- کلیسا کو بالآخر شکست ہوئی اور والتیئر کے بعد اس کو وہ حیثیت حاصل نہ رہی جو دو ہزار سال سے چلی آ رہی تھی-

والتیئر کی تحریروں اور جدوجہد نے آج کی دنیا کے اس بنیادی اصول کو منوانے میں نمایاں حصہ لیا ہے کہ آزادی انسان کا بنیادی حق ہے- یہ کوئی رعایت نہیں ہے جو بعض حکمران عوام کو دیتے ہیں اور بعض دوسرے ان سے چھین لیتے ہیں- بلکہ یہ فرد کا ایسا فطری حق ہے جس سے اس کو محروم نہیں کیا جاسکتا- مانا کہ آج کے زمانے میں بھی ایسی آمرانہ حکومتیں موجود ہیں جو آئین، قانون اور انسانی حقوق کو روند ڈالتی ہیں- ہم لوگوں کو، بدقسمتی سے، دنیا کے اکثر ملکوں کے عوام کے مقابلے میں اس قسم کی حکومتوں کا زیادہ ہی تجربہ ہے- مگر ہم دیکھتے ہیں کہ آج کے زمانے میں ناجائز حکمران بھی قانونی تحفظ حاصل کرنے کی تگ و دو کرتے ہیں- وہ عدالتوں پر دباؤ ڈالتے ہیں، دھمکیوں سے کام لیتے ہیں یا پھر لالچ دے کر قانونی جواز حاصل کرتے ہیں- ننگی آمریت اب ماضی کا قصہ بن چکی ہے- بلا شبہ یہ تبدیلی جس نے ہر انسان کو اپنی عقل استعمال کرنے کا حق عطا کیا ہے اور عام لوگوں کو وقار دیا ہے، وہ کئی انسانی نسلوں کی سخت جدوجہد کا نتیجہ ہے- اس کے لئے کسی ایک شخص کو کریڈٹ دینا ہرگز مناسب نہیں- لیکن ہم ان افراد کو نظر انداز بھی نہیں کرسکتے جن کی انفرادی جدوجہد نمایاں ترین تھی اور جنہوں نے اس اجتماعی جدوجہد کی رہنمائی کی تھی- والتیئر ان افراد میں سے ایک ہے- اب وہ آزادی کی بین الاقوامی علامت بن چکا ہے-

فرد کے طور پر دیکھا جائے تو بے شک اس نے کامیاب زندگی بسر کی۔ قدرت بھی اس پر مہربان رہی۔ چنانچہ ہم نے دیکھا کہ اس کی زندگی میں کوئی ایسا بڑا سانحہ پیش نہ آیا تھا جس نے اس کو اپنے پسندیدہ انداز کے مطابق زندگی بسر کرنے سے روک دیا ہو۔ جو چند کڑے وقت اس کی زندگی میں آئے، وہ اس نے حوصلے کے ساتھ برداشت کئے اور آگے کی طرف اپنا سفر جاری رکھا۔ مادام ایمیلی کی بے وقت موت اس کے لئے المناک تھی۔ لیکن اس نے چند ہی روز میں اس کے اثرات پر قابو پالیا اور پھر سے اپنے ڈھنگ کے مطابق زندگی زیادہ بھرپور، توانا اور تخلیقی ہوگئی تھی۔ اس کو خود بھی اپنی خوش بختی کا احساس تھا، چنانچہ جب وہ ساٹھویں سالگرہ منا چکا تھا تو اس نے اعتراف کیا کہ وہ دنیا کا سب سے زیادہ خوش باش شخص ہے۔

والتیئر کی زندگی کا مطالعہ کرتے ہوئے آپ نے دیکھا ہوگا کہ وہ زندگی کی مسرتیں اور لذتیں حاصل کرنے پر ہر وقت آمادہ رہتا تھا۔ اس کی شخصیت میں اعلیٰ ذوق، شائستگی اور نفاست تھی...... مگر ایک قسم کا کھلنڈرا پن بھی تھا۔ اور ضرورت پڑنے پر وہ عامیانہ سطح پر بھی اتر آتا تھا۔ اس کی شخصیت میں بیشمار تضادات تھے۔ مگر قابل غور بات یہ ہے کہ ان تضادات نے اس کی شخصیت کو خانوں میں تقسیم کرنے کے بجائے اس کو گہرا اور پیچیدہ تر بنا دیا تھا۔ یوں کہیے کہ اس کے پاس کئی نقاب تھے اور وہ والتیئر رہتے ہوئی بھی، حالات کے تقاضوں کے مطابق، نقاب تبدیل کرتا رہتا تھا سچائی سے اس کو محبت تھی، مگر یہ محبت غیر مشروط نہ تھی۔ جب سچائی مفید ثابت نہ ہو، یا غالب نہ رہے اور خطروں کا باعث بن جائے تو وہ اس سے اپنا دامن چھڑانے میں کوتاہی سے کام نہ لیتا تھا۔ اس نے شاید ہی کبھی تاریخ کا مطالعہ غیر جانب داری یا تجریدی سچائی کے متلاشی کے طور پر کیا ہو۔ اس کے بجائے وہ اپنے مقاصد، خصوصاً مسیحی عقاید کی دشمنی کے حوالہ سے تاریخ پڑھتا اور لکھتا تھا۔ وہ بادشاہوں پر ہنستا تھا، لیکن ان کی خوشامد بھی کرتا تھا۔ وہ ارباب کلیسا کو لطف وکرم اور کشادہ دلی سے کام لینے کی تلقین کرتا تھا، مگر خود اس نے اپنے دشمنوں کو کبھی معاف نہ کیا اور نہ ہی ان کے ساتھ اچھا سلوک کیا۔

وہ ہمیشہ طعن وطنز سے کام لیتا تھا۔ ٹھٹھول، تمسخر اور استہزا اس کے ہتھیار تھے۔ جو کوئی اس کے زد میں آجاتا، وہ ناقابل مزاحمت تضحیک کا نشانہ بن جاتا۔ وہ اعلیٰ اقدار کے گن

گاتا، مگر خود ان پر عمل کرنا ضروری نہ سمجھتا تھا- وہ صاف گو تھا اور جھوٹا بھی- راستبازی سے کام لیتا تھا اور مکاری سے بھی- دوسروں کی مدد کرنے پر آمادہ رہتا تھا- لیکن یکدم آنکھیں پھیر بھی سکتا تھا- وہ بہادر تھا اور ڈرپوک بھی- جیل کا خوف اس کو عمر بھر رہا- مگر یہ خوف اس کو ان دلیرانہ مہموں سے باز نہ رکھ سکا جو اس کو پس دیوار زنداں لے جا سکتی تھیں-

وہ مجلسی زندگی کا دلدادہ تھا- اپنی ذہانت وفطانت، حاضر جوابی بذلہ سنجی اور نکتہ آفرینی کے باعث ہر قسم کی محفلوں سے نہ صرف لطف اٹھاتا تھا بلکہ ہر محفل کی جان بن جاتا تھا- اس کی زندگی میں کئی عورتیں آئیں، لیکن اہم رول صرف دو عورتوں نے ادا کیا- ایک مادام ایمیلی تھی اور دوسری اس کی بھانجی اور زندگی کے آخری برسوں کی محبوبہ مادام ڈینس تھی- دونوں ایک دوسرے کی ضد تھیں- مادام ایمیلی عالم فاضل، مہذب، شائستہ اور زندگی کی جسمانی مسرتوں کی دلدادہ تھی، جب کہ مادام ڈینس اکھڑ اور قدرے اجڈ تھی- ان دونوں کے ساتھ اس نے خوب نباہ کیا- اس کے دوستوں کی تعداد بہت زیادہ تھی اور وہ ان سے محبت اور وفاداری سے پیش آنے کا ڈھنگ جانتا تھا-

والتیئر کی زمانے کا فرانس کوئی معمولی ملک نہ تھا- آج کی طرح اٹھارہویں صدی کا فرانس بھی دنیا کا ایک اہم ملک تھا- یوں کہنا چاہیے کہ وہ برطانیہ کے بعد دنیا کی دوسری بڑی طاقت تھا- اس میں دولت کی ریل پیل تھی- کئی براعظموں میں اس کی فتوحات جاری تھیں- اسکی نوآبادیاں قائم ہو رہی تھیں- یوں دنیا کے کئی حصوں سے دولت سمٹ کر فرانس کو منتقل ہو رہی تھی- مگر یہ دولت اور قوت اس کے طبقہ امرا کے قبضے میں تھی- اس چھوٹے سے طبقے کے مقابلے میں آبادی کی بڑی تعداد غربت، محرومی اور کسمپرسی کی زندگی گزار رہی تھی- بہترین قسم کا جاگیردارانہ نظام فرانس میں رائج تھا جس میں شہری طبقہ ترقی کرنے کے باوجود عزت و احترام اور ملکی امور میں کوئی کردار ادا کرنے سے محروم تھا- سب سے خراب حالت کسانوں کی تھی- وہ غیر حاضر جاگیرداروں کے غلاموں جیسی زندگی بسر کرنے پر مجبور کر دیئے گئے ہیں- وہ بے شمار ظالمانہ ٹیکسوں اور ناجائز فرائض کا بوجھ اٹھائے ہوئے تھے- امرا کا طبقہ ٹیکسوں کے علاوہ اکثر قوانین سے بھی آزاد تھا اور صرف ایک مطلق العنان بادشاہ کے سامنے جوابدہ تھا-

اس ظالمانہ نظام میں ذہن وفکر اور تحریر وتقریر کی آزادی کے لئے گنجائش نہ تھی- اہل

مذہب وہی کردار ادا کر رہے تھے جو ظلم، بے انصافی، استحصال اور جبر وتشدد پر مبنی تمام معاشروں میں وہ ادا کرتے ہیں- یوں کلیسا ظلم و استحصال کو برقرار رکھنے والا ادارہ بن چکا تھا- اور اہل کلیسا نے لوگوں کی زندگی کو جہنم بنا ڈالا تھا- وکٹر ہیوگو نے درست ہی کہا ہے کہ اٹھارہویں صدی کے فرانس پر مذہب اور قانون کی حکومت تھی...... مذہب جو رواداری اور روحانیت سے محروم تھا اور قانون جو ظالمانہ اور غیر منصفانہ تھا-

والٹیئر نے اس معاشرے کی تمام بُرائیوں کو قریب سے دیکھا- بار ہا وہ خود بھی ان برائیوں کا نشانہ بنا- یہ بجا ہے کہ وہ غربت سے محفوظ رہا تھا- اس نے شہری طبقے کے ایک مالدار شخص کے گھر میں جنم لیا تھا اور اس نے زندگی میں بہت سی دولت اکٹھی کی تھی- اس کا خیال تھا کہ دولت سے اس کو لکھنے اور بولنے کی آزادی مل جائے گی- مگر دولت مندی اور بے پناہ شہرت کے باوجود اس کو عام لوگوں کے مقابلے میں صرف محدود سی آزادی حاصل ہوسکی تھی- سرکاری اور مذہبی حکمران اس کی مذمت کرتے تھے- اس کی اکثر تحریریں احتساب کی زد میں آئیں اور نذر آتش کی جاتی رہیں- ان صاحبان اقتدار کی گرفت سے خود کو محفوظ رکھنے کی خاطر اس کو ہمیشہ حیلوں بہانوں سے کام لینا پڑا تھا-

یہ سزائیں اور مذمتیں معاشرے کے خلاف بغاوت کا نتیجہ تھیں- مگر وہ اپنی بات کہنے کے نت نئے طریقے ڈھونڈتا رہا- پھر بھی شاید ہم کہہ سکتے ہیں کہ اس کے خیالات اس سے کہیں زیادہ باغیانہ تھے جتنے کہ اب ہم کو اس کی تحریروں میں ملتے ہیں- حکومت اور کلیسا کی بے لچک سنسر شپ اور سزا کے خوف کے باعث اس کو اپنے خیالات کی کاٹ کم کرنی پڑتی ہوگی-

اس کے باوجود والٹیئر کی شہرت اور عظمت وقت کے ساتھ ساتھ کم ہونے کے بجائے بڑھتی جارہی ہے- آج ہم اس کو روشن خیالی کا نمونہ سمجھتے ہیں- اس کے مداح اور مخالف دونوں اس کو اٹھارہویں صدی میں وقوع ہونے والی تبدیلیوں کا ایک زبردست عامل تسلیم کرتے ہیں، وہ محدود اور نصابی معنوں میں فلسفی نہ تھا- بس یوں سمجھیئے کہ وہ وسیع علم اور نکتہ رس ذہن کا مالک تھا- اس کو اظہار پر قوت حاصل تھی اور وہ اپنی بات کو موثر انداز میں بیان کرنے کی اہلیت رکھتا تھا- ان خوبیوں نے اس کو تاریخ کے عظیم افراد میں شامل کردیا- ہم آسانی کے ساتھ اس کو تاریخ کے ان چند افراد کے گروہ میں شامل کرسکتے ہیں جنہوں نے

انسانوں کو سب سے زیادہ متاثر کیا۔ اس کی تحریروں کے سینکڑوں ایڈیشن نکل چکے ہیں۔ ان کا دنیا کی بہت سی زبانوں میں ترجمہ ہو چکا ہے اور خود اس پر سینکڑوں کتابیں لکھی گئی ہیں۔

والتیئر آج بھی مذہبی بنیاد پرستی اور سیاسی آمریت کے خلاف آزادی ضمیر، انسانی حقوق اور انصاف کی علامت کے طور پر جانا جاتا ہے۔ یہ مانا کہ وہ بنیاد پرستی اور جبر کو ختم نہ کر سکتا تھا مگر اس نے تاریک قوتوں کو دفاعی جنگ لڑنے پر مجبور کر دیا تھا۔